

معاذ اللہ

گلشنِ پیار کے عکاس

Urdunoto.com

صبح کا ذب کا وقت تھا مشرق کی سیئت آہٹ

پرسرخی نے ابھی پھیلنا شروع ہی کیا تھا چڑیوں کی۔

یہ چھیا ہٹ سے فضا بھری ہوتی تھی، لان میں ابھی تک
رات کی رانی کی عہک موجود تھی انہوں نے جاگزیں کے نشہ

ناولٹ

مانڈھے اور گہٹ کھول کر باہر سڑک پر نکل آئے دوستان
بڑی تھی، دور ایک دودھ والا اپنی موٹر سائیکل پر جانا
نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے شمال کی سمت مڑ کر کے دوڑنا
شروع کر دیا۔

ریٹائرڈ ایس بی اے جیلانی کی سہ صبح کا آغاز اسی
طرح سے ہوا کرتا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر جاگنگ کے
لئے نکلنا اور قریبی پارک میں ایکسرسائز کر کے آٹھ بجے
واپس لوٹنا۔ واپسی پر درجہ ان کی منتظر ہوا کرتی تھیں

بچے بھی ناشتے سے فارغ ہو کر کالج اور یونیورسٹی جانے
کے لیے تیار ہوتے۔ وہ اور سچ جوں لیتے، اخبار پڑھتی کرتے پھر
ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی اسٹڈی میں جا بیٹھتے، پرسوں
سے پہلی ان کے معمولات تھے۔ پانچ برس ہو چکے تھے انہیں
ریٹائرمنٹ لینے

جس صاحب۔ احسن صاحب۔ انہیں محسوس ہوا
کوئی کافی فاصلے سے انہیں پکار رہا تھا۔ رک کر ہانپتے
ہوئے انہوں نے سڑک روک لی۔

وہ ایک ریچاس بچپن برس کا غریب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بکھرے بالوں اور کچھڑی وار قاضی کے ساتھ وہ بڑا پریشان حال لگ رہا تھا۔ بمشکل گھسٹا وہ ان تک پہنچا۔

”جی فرمائیے، انہوں نے شائستگی سے پوچھا۔

”اسن صاحب امیری مدد کیجیے۔ خدا را امیری مدد کیجیے“ اس نے ہاتھ میلے۔

”آپ کون ہیں قلیل۔ کیا بات ہے؟“ انہوں نے قدر نرمی سے پوچھا۔

”میں۔ میں جی۔ میرا نام حاکم ہے“ اس نے تھوک لگایا۔ ”میں چوہدری عنایت علی کامالی ہوں۔“

واضح طور پر وہ ان سے بات کرتے ہوئے بے حد نروس معلوم ہوتا تھا۔

”جی۔ میں واقف ہوں ان سے۔ آپ اطمینان بات کریں۔ بلکہ پارک قریب ہی ہے وہاں تک چلتے ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ لگتا تھا اس کے جسم کی ساری قوت و توانائی ختم ہو چکی ہے وہ بمشکل گھسٹ رہا تھا۔

”اسن صاحب۔ میں روز صبح آپ کو اس سڑک پر دیکھتا ہوں مجھے معلوم ہے آپ پولیس میں بڑے افسر رہ چکے ہیں۔ خدا کے بعد اب میری واحد امید آپ ہیں۔“

”آپ۔ آپ۔ وعدہ کریں امیری مدد کریں گے۔“

وہ تھا وہ سڑک پر بیٹھ گیا اور ان کے قدموں پیٹ کر دھار مارنے لگا۔

”میری ایک ہی بچی ہے اسن صاحب۔ اس کے ساتھ کچھ بڑا ہوا توہین مر جاؤں گا۔ یہ میں مر جاؤں گا۔“

”آپ۔ اچھے توہی۔“ انہوں نے پریشانی سے جھک کر اس کے بازو تھامے۔ ”دیکھیے مجھ سے جو سن بڑا میں کروں گا لیکن آپ اس طرح میت کیجیے۔ چلیے کہیں بیٹھ کر آرام سے اطمینان سے بات کریں۔“ وہ اسے لے کر پارک تک چلے آئے۔

”جی۔ یہاں بیٹھیں اور اب بتائیے کیا مسئلہ ہے؟“

”انہوں نے حاکم کو منہ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ

گئے۔

”صاحب! میں غریب آدمی ہوں۔ اس نے کارڈ پر پڑے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”حاکم نام ہے میرا اور چوہدری عنایت علی کامالی ہوں۔ یہ دو سڑک چھوڑ کر ان کی کوٹھی ہے۔“

یہ باتیں وہ پہلے بھی بتا چکا تھا لیکن وہ اسے ٹوکے بغیر خاموشی سے سنتے رہے۔

”ایک ہی بچی ہے میری لہجہ نام کی رماں اس کی پیداوار تھی پر اس کی مرگئی تھی۔ صاحب! غریب آدمی کھانا مشکل سے ہے، علاج معالجہ کے لیے کہاں سے پیسہ لائے۔“

”تو جی لہجہ کو میں نے باپ اور ماں دونوں ہی بن کر پالا ہے لیکن میری بچی۔“ وہ پھر رونے لگا۔

”بچانے کس حال میں ہوگی وہ۔“

”کہاں ہے وہ؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

”نامعلوم صاحب۔ کہاں ہے وہ۔ لیکن مجھے یقین ہے، اللہ کی قسم مجھے یقین ہے اسے چھوٹے بالو اور ان کے دوستوں نے ہی اٹھایا ہے۔ خدا ان بد بختوں پر اپنا

خدا نازل کرے۔“

”چوہدری صاحب کے سرب سے چھوٹے بیٹے عارف صاحب! انہیں کی بڑی نگاہ تھی میری بچی پر۔“

”دیکھیے۔ اگر آپ اس طرح بے ربط باتیں کریں گے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔“ وہ بے بسی سے بولے

مجھے اتنا بے بسائی۔“

”بس جی بڑھے تھے کچھ لوگ تو ہم ہیں نہیں بھائی! ان پڑھ تو اپنے جیسی ہی بات کرتا ہے۔ اور بات تو صرف یہ ہے جی کہ میں اور لہجہ چوہدری صاحب کے بنگلے کے پیچھے بے سرونٹ کو اڑھیں رہتے تھے۔ میں وہاں مالی کا کام کرتا تھا۔ وہ بھی اندر بنگلے میں بیگم صاحب کے چھوٹے موٹے کام نپٹا دیا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کسی بار کہا جی، کہ وہ بنگلے میں نہیں جانا چاہتی۔ اسے اچھا نہیں لگتا۔ ادھر میں جاہل گنوار سمجھ ہی نہ سکا وہ غریب کیوں ایسا کہتی ہے؟ میں تو یہی سمجھتا رہا جی کہ سستی کی ماری ہے، کابل ہے کام کرنا بڑا لگے ہے اسے۔ لیکن میں نے تو سوچا ہی نہیں کہ ایسا سارا کام جو بچی اتنی کھرتی ہے اتنے سلیقے سے

UrduPhoto.com

کرے گا۔

• دنیا آپ کی: کامبیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی،
انصاف آپ کا۔ ہمارا تو بس خدارہ جانا ہے۔ اور درحقیقت
وہی اصل ہمارا ہے۔

”ہوں۔“ آہن نے منہ کا راجھرا۔ ”چھر۔ کسا سوا۔“

ماہرین صاحب! "ماکم ان کی خاموشی سے خوشنودہ ہو گیا۔ آپ - آپ - میری مدد کریں گے نا؟"

انہوں نے ایک نگاہ اس پید ڈالی۔ بڑی خاموش۔

بے حد تجھی ہوئی نگاہ۔

”احسن صاحب! یہودیہ نیچے بیٹھ کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔“

سر پر اتنے قرض ہیں کہ ان کے بوجھ سے میرا سالانہ
دو مہرے ہیں تو بس کسی بھی طرح، محفوظ اس بوجھ ہلکا
جانشانوں۔

شوکت تھانوی کی مزاحیہ اور دلچسپ کتابیں

خطبی	مکر اسٹیں
خوا منخواہ	میلے جگم
مکر ارشاد	چنگی
بہر ویا	الہ حول و لا تد
	و ہم زلف

”آپ بڑے آدمی ہیں احسن صاحب۔“ آکسو پوچھ کر وہ ایک بازار چھڑکوا کر آواز میں بولنے لگا۔ ”پولیس میں بڑا نام ہے آپ کا جی۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں غریب آدمی تو آپ کو کچھ نہ دے سکوں گا ہاں۔ وہ خدا ضرور مہربان ہو گا آپ پر۔ ساری عمر میں اور میری بچی آپ کو دعا میں دیں گے۔ خدا آپ کو دونوں جہان میں سرفراز

نوٹ: 100 روپے زائد کے آرڈر پر 20 فیصد رعایت ہے
50 روپے سے کم مائیت کے آرڈر کاوسی پی نہیں بھجوا یا جاتا

شقیع بیاد قرۃ

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، لان کی سمت کھٹنے والی کھڑکی سے ہلکی سی روشنی اندر آکر فرش پر ایک خاص مقام تک بھیجی ہوئی تھی۔ باقی سہر جگہ اندھیرے کا راز تھا۔ راکنگ چیر پر آگے بچھے بھولنے ہوئے ان کا دماغ ماضی کی اٹھارہ اندھیرے غار میں ایک خاص جگہ معلق تھا۔

”دنیا آپ کی، کامبیا بیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، انصاف آپ کا، عمارتوں میں خدارہ جاتا ہے اور درحقیقت وہی اصل سہارا ہے۔“

راکنگ چیر کی حرکت تھم گئی اور احسن جیلانی نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ہتھکے پر ان کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ انہیں لگا، اب وہ کبھی ہاتھ کھول نہیں پائیں گے وہ ہارٹ پمپنگ نہیں تھے لیکن کبھی بھی ان کا دل ان کا سینہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔ انہیں بے پناہ درد کا احساس ہوتا تھا اور ڈاکٹر ز اس درد کو ان کا وہم قرار دیتے تھے۔

دریہ نے اندر آکر لائٹ جلائی، تب ان کا وجود کسی آن دیجی گرفت سے آزاد ہوا۔ کمری پر ایک طرف کو جھٹک کر وہ گہرے اندھیرے میں لپٹ گیا۔

”احسن۔ احسن۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں ان کا ندم تھا کہ پوچھنے لگیں۔

”ڈاکٹر کو فون کروں؟“ وہ نے بے بسی سے پوچھا۔

”نہیں دریہ۔ نہیں۔“ انہوں نے بے بسی سے پوچھا۔

”کر جاتی دریہ کا ہاتھ تھا۔ یہاں بھی رہو میرے پاس۔“

”احسن ہے؟“ وہ رو دینے کو ہو گئیں کرنے دیجے فون۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“

”دریہ پلیز۔ مجھے تنہا چھوڑ کر مین جانا۔“ انہوں نے منت کی۔

وہ پریشانی سے انہیں تکتے ہوئے ان کا سینہ سہلانے لگیں۔

”پانی پی لیں۔“

”ہاں، ٹھیک ہے بھر دو گلاس۔“

”کچھ بہتر محسوس کرتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا اور کمری

کی پشت سے لگا دیا۔

”احسن! کیا ہو جاتا ہے آپ کو؟“ گلاس بھرتے ہوئے وہ بول رہی تھیں آپ بالکل ٹھیک ٹھاک، نارمل انسان ہیں۔ سارے ڈاکٹر ز یہی کہتے ہیں۔ ہر ٹیسٹ رپورٹ صحیح ہوتی ہے، پھر یہ کیسا درد اٹھاتا ہے آپ کو۔ اور آپ اتنی دیر تک بیدار رہیں کیوں نہیں آتے، طبیعت ٹھیک نہیں تھی، پھر بھی اسٹڈی میں بیٹھے رہے۔“

”دریہ۔“ انہوں نے پانی پی کر گلاس ساؤنڈ ٹیل پر رکھا۔ ”تم نے اس شخص کی چیخ و پکار نہیں سنی؟“

”سستی تھی، اس کا درد محسوس بھی کیا۔ رونی بھی لیکن پھر نارمل ہو گئی۔ دو دن گزر چکے ہیں اس واقعہ کو۔ کمال ہے آپ ریٹائرڈ ایس پی ہیں، آپ نے اتنا فیل کیا؟ آپ نے تو اپنی زندگی میں ایسے بے شمار کیسز دیکھے ہوں گے۔“

”دریہ۔“ وہ نے کہا، جہاں کہیں کسی مظلوم لڑکی کی عزت داؤ پر لگتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کا گناہ میرے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

ان کی آواز بھڑکنی۔

”لیکن کیوں احسن کیوں؟“ وہ نے پوچھا۔ آپ کا میں سارے وقت سے یہ کہتا ہوں کہ کوئی قصور ہے؟ آپ نے تو اس غریب کی مدد ہی کی نا۔ اس بے چارے کی زندگی

اب بھی کچھ خوشگوار تو نہیں گزرے گی لیکن پھر بھی وہ اس اذیت ناک سوال کی زد میں نہیں رہے گا۔ کہ اس کی بیٹی گناہان اور کسٹھالی میں ہوگی۔ کم از کم وہ اس کی قبر پر میری قبر کے ساتھ دفن ہو سکے گا نا۔ پھر یہ خلش آپ کے دل میں کیوں رہ گئی ہے کہ اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور آپ کا بھی ہے۔؟“

”انہوں نے ایک بے بس، بے چین نگاہ ان پر ڈالی۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔“

”میری خواہش تھی کہ میں اس لڑکی کی مدد کرتا۔“

”جی۔“ ہر شریف، نیک شخص ایسا ہی چاہتا ہے۔“

وہ نرمی سے ان کا ندم دبا کر بولیں۔

”لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا، تب بھی آپ بے قصور

65

کی نگاہوں پر اور پھر جب یہی حالت دہرائی تو یہ سب چیزیں
میں الجھ گئی۔

”واہ بچی۔“ اس نے غصہ سے آواز بھر کر سناٹا کر دیا۔
رہا میں اگر کیسے کیسے محل بنا دیتے ہیں۔ ہم سے ایک
زندگی کی بنیاد ٹھیک سے نہیں ڈال جاتی۔ احسن جلالی
سائبان آپ کی قسمت میں ہی رکھا تھا۔ آنیسر بننے کے
نواب دیکھتے دیکھتے ٹیوٹن ماسٹر بن جاتا۔“

بچتے چلتے جب وہ ایک شغاف، رواں زندگی نکلت
جاسکتا ہے اسے احساس ہوا کہ وہ غلط سمت میں نکل
آیا ہے۔

”سٹوڈنٹ! اس نے وہاں کھیلنے بچوں میں سے ایک
کو مخاطب کیا۔ یہ دریاخان کا مکان کہاں ہے؟“
وہاں۔“ بچے نے ٹھنکے سے اشارہ کر دینا ہی
کافی سمجھا۔

اس کی نگاہ نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔
اور ناکام لوٹ آئی۔

”مجھے وہاں تک چھوڑ دو۔“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔
”چلو۔“ وہ فوراً مان گیا۔

باقی بچوں کے بھی ان کا ساتھ دینا مناسب خیال کیا۔
اور یوں وہ ایک قافلہ بن کر نکلتے ہیں۔ دریاخان کے گھر
تک پہنچے۔

”مجھے یقین تھا تم آؤ گے۔“
دریاخان نے بڑھاپے کی جوشی سے اس کا استقبال
کیا تھا۔

”مجھے یقین تھا میں نہیں آؤں گا۔“ وہ ہنسنے سے
لیکن بعض اوقات ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تو
ہوتے ہیں لیکن ہمارے سامنے محض ایک ہی راہ ہوتی
ہے۔“

”نکال دو یا ماموں نے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں نکالنا تو نہیں ہے لیکن رکھا بھی نہیں۔“ ٹھیک ہے
بارٹھیک ہی ہے۔ اپنے گھر کے ماحول کو وہ میری وجہ سے
خراب تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں ہیں
اور مامی کو یقین ہے ان میں سے کوئی ایک ضرور مجھ سے
سچیہ ہو کر اپنا مستقبل بنا کر دے گی۔“

”اوتے تو گھروں کی ایسا ہے۔“ دریاخان زور سے
”محض گھروں کو کوئی نو جوان کسی لڑکی کو اچھا مستقبل

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریاخان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تحکین کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
بے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے مشکل
لی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

دریاخان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تحکین کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
بے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے مشکل
لی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریاخان نہیں کر سکتا۔ وہ سبیدگ سے بولا۔ مامی کو میری
وہ بات سے نہیں سمجھتی ہے۔ سروسامان سے غصہ تو
اگر میرے پاس ایک عذر اچھی نوکری ہوگی تو وہ فوراً
سے کہہ کر ان باتوں میں سے کسی ایک سے میری شادی
جلد سے جلد کرانیں۔ اگر کمر کا دیکھا، جلالی کی کہیں بہرہ
محسوس ہائے۔

”ٹھیک ہی ہے سہراں اپنی بیٹیوں کا جلالی پتا
ہے۔“

”وہ خود کو تیری ہی ماں سمجھ سکتی تھیں؟“
”تم بتاؤ۔“ اس نے جان بوجھ کر سو منوع بدل دیا۔ نوکری

”ہے یاگنی؟“
”یہ تو اب مجھے بھی خبر نہیں۔ اس کے بعد جو بی جانا سیر
ہوا۔ تم نے آئے ہیں دن بھی تو لگا دے۔ امتحان دے

کافی سمجھا۔“
”ارے بھئی۔“

اس کی نگاہ نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔
اور ناکام لوٹ آئی۔

”مجھے وہاں تک چھوڑ دو۔“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔
”چلو۔“ وہ فوراً مان گیا۔

باقی بچوں کے بھی ان کا ساتھ دینا مناسب خیال کیا۔
اور یوں وہ ایک قافلہ بن کر نکلتے ہیں۔ دریاخان کے گھر
تک پہنچے۔

”مجھے یقین تھا تم آؤ گے۔“
دریاخان نے بڑھاپے کی جوشی سے اس کا استقبال
کیا تھا۔

”مجھے یقین تھا میں نہیں آؤں گا۔“ وہ ہنسنے سے
لیکن بعض اوقات ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تو
ہوتے ہیں لیکن ہمارے سامنے محض ایک ہی راہ ہوتی
ہے۔“

”نکال دو یا ماموں نے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں نکالنا تو نہیں ہے لیکن رکھا بھی نہیں۔“ ٹھیک ہے
بارٹھیک ہی ہے۔ اپنے گھر کے ماحول کو وہ میری وجہ سے
خراب تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں ہیں
اور مامی کو یقین ہے ان میں سے کوئی ایک ضرور مجھ سے
سچیہ ہو کر اپنا مستقبل بنا کر دے گی۔“

”اوتے تو گھروں کی ایسا ہے۔“ دریاخان زور سے
”محض گھروں کو کوئی نو جوان کسی لڑکی کو اچھا مستقبل

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

دریاخان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تحکین کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
بے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے مشکل
لی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

دریاخان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ
شدید تحکین کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن
سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے
بے کوئی ٹھکانا اس کے پاس تھا نہیں، سرکاری اسکول
اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے مشکل
لی۔ کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

”ارے سرتی جان بہ بیویوں کی تحکین ہے۔“ وہ کھڑی
جا رہی تھی۔ سب سے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ٹیٹ گیا۔ ایک رات
کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔“

نڈاش میں نکلی کھڑا ہوا تھا، جو کہ تماہال اسے حاصل نہ ہو سکی تھی۔ بھیلہ لگانے یا جوتوں کی دکان پر بیٹھنے کو اس کا دل تیار ہی نہ ہوتا تھا کہ بچپن سے آنکھوں میں بڑا آفیسر بننے کے جو سنہرے پنے اس نے سجائے تھے ان کے پر جلنے پر اس کا پورا وجود شدید بد تکلیف محسوس کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی اسے کم از کم کلرک کے درجے سے پیچھے نہ آنا پڑے۔ زندگی میں ایک بلند مقام حاصل کرنے کی دھن سر میں سمائی تو اس نے سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دی۔ نوکری کی نڈاش لا حاصل کو ترک کر کے وہ سارا سارا دن لائبریری میں بیٹھا رہتا۔ گھر آتا بھی تو صرف کھانا کھانے کے لیے اور یہی بات سمائی کے لیے انتہائی فکر و پریشانی کا باعث تھی کہ اس عمر کا جوان سوائے روٹیاں توڑنے اور لڑکیوں کو گھورنے کے کچھ نہیں کرتا۔ روٹیاں توڑنے والی بات ٹھیک تھی، اور اس نے بنا کھسی پس و پیش کے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن دوسرا التزام برداشت کر لینا قطعاً ناممکن تھا۔ وہ اسی گھر میں بل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ لڑکیوں کو اس نے ہمیشہ اپنی بہنیں سمجھا تھا انہیں غلط نظر سے دیکھنے کا التزام اس کے لیے ایسی تکلیف اور کھٹن کا باعث بن گیا کہ اسے اس کی گھڑیں قدامت رکھنے ہوتے بھی شرم محسوس ہونے لگی۔

اپنی حالات میں اسے دریاخان کا خط موصول ہوا اور دریاخان اس کے بچپن کا دوست تھا اور اس کے ساتھ اسکول اور کالج میں زیر تعلیم رہا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اپنی زمینیں سنبھالنے کی غرض سے وہ اپنے آبائی گاؤں والپن پوٹ گیا تھا اور وہیں اس نے اپنی چچا زاد سے شادی کر لی تھی۔ احسن جیلانی بھی اس شادی میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا اور بھی اس نے دریاخان کا گاؤں دیکھا تھا۔

دریاخان نے اپنے خط میں اسے ایک نوکری کی بابت کھا تھا۔ اس کے گاؤں کے بڑے زمیندار کی بیٹیوں کو گھر پر تعلیم دینی تھی اور اس کے لیے اسے ایک خاص پیکٹ شس معائنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ لیکن احسن نے وہ خط بڑھ کر بے دلی سے ایک جانب ڈال دیا تھا۔ معاوضہ شریک شس ضرور تھا لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی، اس کی آنکھوں میں بلند یوں کے پنے

تھے۔ فطر تادہ شاہین تھا۔ ذرا ذرا سے دانے کے لیے زمین پر اترتا اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے امتحان دیا اور ایک بار پھر فٹ پاٹھوں پر جوتیاں چھانے لگا۔ اور وہ رزلٹ آنے تک یا شاید اس کے بعد بھی یہی کرتا رہتا۔ اگر ایک رات ماموں اور مامی کی گفتگو نہ سن لیتا۔ مامی کا خونخوار لہجہ، تیتے الفاظ اور ماموں کی کمزور، ٹوٹی چھوٹی مدافعتی گفتگو نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اسے کسی سے شکایت نہ تھی، اس گھر کی شکستہ دیواروں نے بہت عرصہ تک اسے زمانے کے سر و گردہ سے بچائے رکھا تھا۔ اور اب واقعی یہ اس کا فرض بنتا تھا کہ اس گھر کے مکینوں کی مشکلوں کو کم نہ کر سکتا ہو تو ان میں اضافہ بھی نہ کرے۔ ہر خند کہ بہ اس کا ارمان تھا کہ وہ اچھی سی نوکری ملنے کے بعد اپنی ماموں زاد بہنوں کے رشتے تلاش کرے، انہیں بلا غیبت و خصلت کرے، اور ماموں اور مامی کی خدمت کر کے ان کے احسا لوں کا بوجھ کم کرنے کی اپنی سی سعی کرے۔ لیکن اس کی اپنی فطرت اس کے ارمانوں کی کھلی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ سو وہ کھٹا کر سکتا تھا۔

اس نے دریاخان کا خط تلاش کیا اور اپنے ایک عزیز دوست کو ساری بات بتا کر بیان چلا آیا۔ ماموں کا اور خود سامنا کر کے ان کا جواب دیا اور شرمندہ نظر دیکھنے کی اسے تاب نہ تھی۔

اگلی صبح اسے چڑیوں کی بے پناہ شاہکار نے جگایا۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر صحن سے آتی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ یہاں علی الصبح گھر کے تمام افراد جاگ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے، اور دریاخان کے گھر میں اس کی بیوی اور دو بہنوں کے سوائے کچھ ہی کون۔

نشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے غسل کر کے بائیں تبدیل کیا اور دریاخان کی ہمراہی میں حویلی کی جانب چل دیا۔ کھیت کھیاں، پگڈنڈیاں، شفاف پانی لانی چھوٹی چھوٹی نالیاں۔ اسے ہر شے بڑی نکھری، بڑی پاکیزہ لگی۔

”یار دریا، فطرت انسان کی سب سے بڑی دوست ہے، مجھے اکثر احساس ہوتا ہے۔“

”احسن۔ آبا کے انتقال پر میں سوچتا تھا کہ میں شہر میں پلا بڑھا شخص کس طرح یہاں کی زندگی میں ایدیت

ہوسکوں گا۔ زمینوں میں مل چلا تا کیسا لگوں گا۔ ایک قطعاً
ان پر بڑھ، جاہل لڑکی سے کیسے نباہ کر پاؤں گا۔ لیکن اب
مجھے یقین ہو چلا ہے کہ انسان بنا تو مٹی سے ہے لیکن
فطرت پانی کی سی رکھتا ہے جس برتن میں ڈال دو وہی
شکل اختیار کر لیتا ہے، جس رنگ میں ملاؤ وہی رنگ
اپنا لیتا ہے، بگڑا ہوا ہو تو سیلاب بن کر سرے کو تباہ
کر ڈالتا ہے، اور سدھرا ہوا ہو تو زندگی میں دور دور
تک سبزہ لگا دیتا ہے پھول کھلا دیتا ہے۔ بارگاہوں
آکر میں نے خدیجہ سے شادی کی تو مجھے پتا لگا کہ عورت نور
ہوتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق دنیا کے کسی حصے کسی گوشے
سے ہو، ایک شیشے کی بوتل، جس پر آب کسی طرح کا بھی لیل
لگا دیں۔ شہر کا یا گاؤں کا۔ بوتل شیشے کی رہتی ہے اس
کی ساخت وہی رہتی ہے۔ اسی طرح عورت ایک ہے
اس کی خواہشات ایک سی ہیں۔ دینے اور لینے کے بنیادی

اصول ایک سے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں چلایا تو مجھوں
کیا کہ میں یہی تھا اور یہی ہوں، ایک کسان جو دھرتی کا
سیمہ بچھاڑ کر اپنا رزق نکالتا ہے، لہو کا پسینہ بناتا ہے
اور وہ پسینہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ اور وہی خاک پھر اسے
رزق اکلتی ہے۔ یہ ایک حکم ہے اور میں ہمیشہ سے اس
چکر کا ایک حصہ ہوں۔ میں نے اسی سادہ سیلٹ اپ
کو اس طرح سے قبول کیا جیسے میں ہمیشہ سے یہی تھا جیسے
میں یہاں سے نکلیں گیا ہی نہیں۔ اسی طرح احسن جیلانی
تم محسوس کرو گے کہ جہاں ہو اور جیسے ہو۔ تم درحقیقت یہی
چاہتے تھے، بار بار انسان نے سینوں کی سنہری سری کولوں
چھو نہیں پاتا، بکیر نہیں پاتا تو حقیقت جلد اس کی آکھیں
اپنے ارد گرد بسنے والی حقیقتوں سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ یہی
انسانی فطرت ہے۔ یہاں آنے سے قبل تم ضرور مایوسی اور
طیسریشین کا شکار رہے ہو گے کہ گاؤں کی زندگی میں کیسے
کھل مل سکو گے، لیکن آج تمہاری یہی فطرت اپنی درست
لگتی ہے۔

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور چلتا رہا۔
نجانے دریا خان درست کتنا عطا یا غلط۔ لیکن اس کے
اپنے اندر کہیں بہ طے تھا کہ سمجھوتے ہو تو جانے میں لیکن
ایک ایسے بند دروازے کی مانند ہوتے ہیں جس میں سے
بہر کوئی امید، کوئی خوشیوں، کھرا خواب انسان کے دل
کے اندر نہیں جھانک پاتا۔ جیسا اس نے سوچا تھا، تو کچھ

اس نے چاہا تھا۔ اگر وہ بیان نہ سوتا تو وہ سمجھوتا تو کرنا
لینا۔ ہاں کبھی خوش نہ ہو سکتا تھا۔ اتنا وہ جانتا تھا
دریا خان اگر آج اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا اور خوش
بھی، تو یہ بہت پہلے اس کے اندر کہیں بٹے ہوا ہوگا۔
"لوجی۔ آگئی منزل۔"

دریا خان کی آواز پر وہ چونک کر خیالوں کے کنوڑ
سے ابھرا۔ اس کے سامنے وہی عالی شان۔ پیر شکوہ تھوڑے
کھڑی تھی جس کی برہیوں نے کل اس کے اندر عجب شکر
کے گل کھلائے تھے۔

"اندر اطلاع کرو دریا خان ماسٹر صاحب کو کہ
آیا ہے۔" دریا خان جو کیدار سے مخاطب تھا۔
احسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"نہیں۔ یہ میری منزل نہیں ہے اس کے اندر کوئی
چلایا۔"

بگم صاحب اندر بکاتی ہیں۔ چوکیدار چند منٹوں میں
لوٹ آیا تھا۔

بڑا سا صحن عبور کر کے چوڑا پیر آمدہ تھا۔ جس میں تین
اطراف میں راستے بنے تھے، ایک مگڑم کی رہنمائی میں
وہ ایک طرف سے گول کمرے میں پہنچے۔ مگر قالمین پر طے
ہوئے۔ وہ گھر کے سامنے سے گئے۔ روبرو پہنچ گئے۔

"السلام علیکم بگم صاحب جی۔" دریا خان نے بار بار
سلام پیش کیا۔
احسن نے تصدیق کی۔

انہوں نے سلام کا جواب دینے کی
ضرورت نہ سمجھی۔ "تم بیٹھو ماسٹر!" اس نے عجیب سی تذیل
محسوس کی اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
"اب آئے ہو دریا خان؟"

"بگم صاحب۔ یہ میرا دوست اپنا امتحان دے رہا تھا
اس سے فارغ ہو کر آیا ہے۔"
"ہوں۔ کتنا پڑھا ہے؟ اب روئے سخن اس کی جانب
تھا۔

"جی۔ میں نے بی کا کیا ہے، اور اب سی ایس ایس
کا انکیزام دے کر آیا ہوں۔"
"وہ کون سا امتحان ہے، یہ بتاؤ کتنی کلاس پڑھے
ہوئے ہو۔"

اسے خاتون کی انتہا درجے کی کم علمی کا احساس ہوا۔
 ”جی چودہ جماعت پاس ہوں۔“

”ہوں۔ اب پندرہویں کا امتحان دیا ہے۔“ انہوں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

”جی!“ اس نے تانسف سے محض اتنا کہنا کافی سمجھا۔
 ”ٹھیک ہے تعلیم تو کافی ہے لیکن۔“ انہوں نے اپنے بے تحاشا جسم کی وجہ سے بمشکل پہلو بندلا۔

”لیکن کیا بیگم صاحب۔ میرا دوست بڑا قابل آدمی ہے۔“

”ہاں ہاں وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی عمر۔
 حلیمہ کے بابا کوئی ادھیڑ عمر۔ یعنی میرا مطلب ہے۔“

”جی بیگم صاحب۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“
 دریا خان نے ملحدی جلدی کہنا شروع کیا۔

”لیکن آپ احسن پر اپنا ہی اعتبار کر سکتی ہیں۔ جتنا کہ مجھ پر کرتی ہیں۔ اس کی شرافت کی ضمانت میں دیا ہوں۔
 اصل میں یہ بے چارہ بڑا ضرورت مند ہے۔“

احسن نے بے چینی کے ادھر ادھر دکھا۔
 ”اچھا۔“ بیگم صاحبہ کچھ کش مکش کا شکار تھیں۔

”چلو۔ ٹھیک ہے۔ کیا تجوڑا مانگتا ہے یہ؟“
 ”آپ جو دیں۔“ وہ سناٹا سب سے بول گئی۔

احسن نے ایک نظر اسے دیکھا جو اب اس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”اچھا۔“ ماسٹر تمہیں لڑکیوں کو بھیجتی ہیں۔
 ”دریا، اب تم جاؤ۔“

وہ بمشکل اٹھ کر اندر کسی پردے کے پیچھے کم ہو گئیں۔

”یار دریا، مجھے تو مشکل لگ رہا ہے۔“
 ”کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بظاہر ایسی ہی لڑکی ہے۔“

”قطعاً خانہ خالی ہے۔ کچھ آتا جانا نہیں، جو کہو گے آنکھ بند کر کے مان لیں گی۔ لڑکیاں بھی ابویں سی ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا تو شوق ہے نہیں، وی سی آر اور ڈش دیکھ دیکھ کر فیشن سیکھ گئی ہیں۔“

”اب کچھ پڑھ لینے کا بھی خیال آگیا ہے۔ بہت آسان سی جاب ہے۔“

”لیکن تم نے توفیس وغیرہ کا بھی کچھ نہیں کہا۔“

”ارے میری جان! ملدی لپٹی نہیں ہیں۔ جتنے دن یہاں نوکری کرو گے، جیب اور منہ دونوں بھرے رہیں۔“

اس کی تم نگرست کرو۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تم اچھی طرح پڑھانا، پہلا دن ہے، اچھا امپریشن ڈالنا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”راستہ تو گھڑنگ کا یاد ہے نا؟“
 ”بھول بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گا۔“ وہ ہنس دیا۔

”دیش گڈ۔“
 وہ اس کا شانہ چھٹپٹا کر باہر نکل گیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نگاہ بیکامپ کھم گئی۔ میروں و میز سروں کے پیچھے کوئی لڑکی چھپ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ جسے اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ اس کے پیر نیچے سے دکھائی دے رہے تھے۔

چاندی کی پازیب سے بچے، سالوئی رنگت کے نازک پیر اس نے چند لمحے دیکھے پھر اندر آتی لڑکیوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ وہ تین لڑکیاں تھیں۔

عمریں پچیس سے بیس کے پورے میان ہوں گی۔ گہرے گہرے رنگوں کے ریشمی سوٹ پہننے، پیر اندے ڈالے چھم چھم کرتی وہ تینوں لاس سے اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”جی سلام ماسٹر صاحب!“ سب نے بڑی جواب دینے کا تکلف کیا۔

”مجھے احسن جیلانی کہتے ہیں۔ میں آج سے آپ لوگوں کو پڑھاؤں گا۔“

”پڑھائیں جی۔“
 ”آپ کی بکس وغیرہ۔“

”وہ تو منگوائی ہیں۔“ اماں کہتی ہیں آپ نام لکھ دیں۔ کل شہر سے آجائیں گی۔“

”اچھا۔ کون کون سے مضمون پڑھیں گی آپ لوگ۔؟“

”تینوں نے ایک دوسرے کی شکل دکھی۔“

”بس جی۔ پڑھنا لکھنا آجائے۔ اردو اور انگریزی۔“

”یعنی۔“ وہ ایک ٹانے کو ششدر رہ گیا۔ آپ لوگوں نے قطعاً کچھ نہیں پڑھ رکھا؟“

”پڑھا ہوا ہوتا تو کیوں لگاتے آپ کو؟“ ایک نے اعتراض کیا۔

”اعتراض کیا۔“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔ ٹیک فرمایا آپ نے۔
 لڑکیوں کی علمی استعداد کا بخوبی اندازہ کر لینے کے بعد
 ابتدا اس نے الف بے اور اے بی سی سے کی اور ایسا
 کرتے ہوئے اس کا دودھ دینے کو جی چاہ رہا تھا۔

”نینوں کو ایک ایک صنف کھنے کا کام دے کر اس نے
 صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ کسی نے بڑے
 باادب طریقے سے چائے کی پیالی اس کے آگے کر دی۔
 احسن نے چونک کر سر اٹھایا۔ سیاہ بھوڑا آنکھیں
 ایک لٹے کو اس کی نظروں سے متصادم ہوئیں پھر ان
 پر پلکوں کی چلیم آگئی۔ اجتراما اس نے بھی نگاہ جھکا
 لی۔ اور تب وہ سالوے، نازک پیراس کی نگاہوں کی
 زد میں آئے، تو یہ بھی وہ لڑکی جو اسے چھپ کر دیکھ رہی
 تھی۔

”شکر ہے۔“ کپ مقام کر اس نے مدھم آواز میں
 کہا۔

وہ بے آواز واپس لڑکی کی طرف
 ”سوہنی۔ پانی لاکر دے پہلے ماسٹر صاحب کو۔“

کم بخت چائے کا کپ لاکر سر پر مارتی ہے۔ نینوں میں
 سے ایک نے اسے آواز دی۔

”جی آپا۔“ بھونکنے کے ساتھ اس نے کپ لاکر
 میں بولی۔

احسن نے پتھر خم آواز سنی اور نام پر مسکرا دیا۔
 ”اسم ماسٹری۔“ اس نے سوچا تھا۔

چند لمحوں بعد پانی کا گلاس اس کے روبرو تھا۔
 ”جی شکر ہے۔“ شکر اٹھائے بغیر اس نے گلاس میں چٹا

سے تھاما۔
 واپسی پر وہ فذری غیر مطمئن تھا۔ لیکن اس نے

دربار خان سے کچھ بھی نہ کہا۔ اور وہ کتنا بھی کیا یہ کہ وہ
 پڑھانے تو آیا تھا لیکن الف بے یا اے بی سی نہیں

یہ تو ایک قطعاً غیر معقول بات ہوتی۔ پڑھانا تو اسے
 تھا ہی۔ پھر اعتراض لیا۔

چند ہی دنوں میں اسے تینوں لڑکیوں کی تمام تر
 قابلیت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا۔ حلیمہ، شمیمہ اور

سلیمہ نامی تین فاقیہ نہیں۔ ارفیق اور بحر چھیر میں
 میں برابر اور ہم وزن تھیں۔ ایک سے نام، ایک سی

شکلیں اور ایک سے دماغ۔ مزید یہ کہ کپڑوں اور
 70

زورات کا شوق بھی ایک ساتھ اور غالباً محسن ہی ایک
 شوق تھا۔ پڑھنا لکھنا تو ایک مجبوری تھی کہ فی وقت
 گاؤں سے باہر کی دنیا دیکھ دیکھ کر انہیں بھی دلایا
 بننے کا شوق جبرایا تھا۔

”ماسٹر جی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں چھوڑیں مجھے تو
 آپ سب سے پہلے انگریزی بولنا سکھا دیں۔“

ایک دن شمیمہ نے بے زاری سے رائٹنگ کا کام
 ایک طرف کر کے کہا تھا۔

”انگریزی بولنا سکھا دوں؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔
 ”یعنی ڈائریکٹ؟ بی بی، اینٹ پر اینٹ رکھے بنا

دیوار کیسے کھڑی کر لوگی؟“
 ”لیکن یہ کام تو بہت بڑا ہے۔ جیسا لفظ آپ بنائیں

نیچے ویسے ویسے بنائے جاوے۔ یہ بھی کوئی کام ہوا؟“
 ”تو باتیں نہ بنا۔ بڑھ بیٹھ کر۔“ حلیمہ نے ماسٹر صاحب

کی مشکل انان کی اور چھوٹی بہن کو ڈانٹ پلائی۔ بڑی
 قابل ہے۔ ماسٹر صاحب نہ باورہ جانتے ہیں کہ تو

شمیمہ نے اسے گھورا اور گالی کی جانب متوجہ ہو گئی۔
 ”ماسٹر صاحب! چائے۔“

احسن جو شمیمہ کی فرمائش میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی
 آواز پر سونپ ہوئی۔ اس نے روڑا نہ اس وقت اس کی چائے

آتی تھی۔ اسی آواز پر وہ چونکنا لگا تھا۔ اور سر اٹھائے
 بغیر کپ مقام لیتا تھا۔ ہاں کچھ بھی اس کا دل بے ایمان

کرنا تھا۔ اور وہ چمکے سے تانولے پیروں پر ایک
 نظر ڈال لیتا تھا لیکن اس سے آگے کبھی کوئی بے ایمان

نظر نہ لگتا تھا۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔
 ”سوہنی۔ کتنی بار سمجھایا ہے تجھے، پہلے پانی لایا

کر۔“ سلیمہ نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔
 ”نہیں جی۔ بس ٹھیک ہے شکر ہے۔“ اس نے مدخلت

کی۔ ”مجھے پیاس نہیں۔“
 ”نہ جی ماسٹر صاحب! چائے سے پہلے پانی ضرور

پیا کریں۔ گرم چائے معدہ جلاتی ہے جا کر۔ پہلے پانی
 سے ٹھنڈا کر لیا کریں۔“ شمیمہ نے بڑے مدبرانہ انداز

میں اسے سمجھایا۔ ”جاسوہنی پانی لا۔“
 وہ بے چارگی سے خاموش ہو گیا۔ اسے بجا تکلف

سے بچانے کے لیے ہی اس نے پیاس نہ ہونے کا عذر
 پیش کیا تھا۔

70

”ماسٹر جی! پانی۔“ بڑی مترنم آواز مٹھی اس کی۔

سماعتوں میں نرمیاں سی اتر جاتی تھیں۔
”شکر یہ!“ اس نے حسب معمول نگاہ اٹھاتے بغیر
پانی کا گلاس نظام لیا۔

نرم۔ میڈ سے گندھی انگلیاں اس کی انگلیوں
سے ٹکرائیں۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ اور بچانے کیوں نگاہ اٹھا
کہ اس نے دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”اب جا۔ پھوٹ۔ کیوں سر پر کھڑی ہے؟“ طیبہ نے
اسے تارڑا۔
وہ جلدی سے سر کر کے سے نکل گئی۔

اور پہلی مرتبہ احسن جیلانی نے رات کو اپنے پلنگ
پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچا۔

”عجیب نوکرانی ہے۔ بھلا کوئی نوکرانیاں بھی ایسی
خو نصورت رکھتا ہے؟“ اسے تو اس حیل کی رانی ہونا چاہیے

تھا۔ وہ چمکیے بھر کیلے لباس جو ان تینوں چڑھوں پر
انتہائی نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پہنشی تو کیسے

سج جاتے۔ چیخ چیخ بے جا لگتی۔ ایسی بھلی صورت اور ایسی
کھوئی قسمت۔

پھر اس نے اس خو نصورت نوکرانی پر اپنا مزید
وقت ضائع کرنے کے بجائے کر دھڑ بھڑا کر بھاگنا

مناسب سمجھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر لوں رواں ہوئی کھٹی کہ وہ خود
حیران رہ گیا تھا۔

”کیا دریا خان سچ کہتا ہے؟“ وہ اکثر سوچتا تھا کہ
میں بہت جلد بھول جاؤں گا کہ میرے کیا خواب تھے۔ میں

کیا چاہتا تھا، کون سی بلندیاں میرے تصورات میں
کھین۔ کیا میں اسی زندگی کو اپنا نصیب جان کر ایسے

ہی نباہ دوں گا۔ لیکن کب تک؟ کب تک یہ تینوں
لڑکیاں انگریزی بولنے کے شوق میں مجھ سے پرہیزی

نہیں گی۔ بہت جلد انہیں اپنی شوقیہ بڑھائی سے اکتا
ہونے لگے گی۔ اور ایک دن مجھے کہا جائے گا کہ میں

کل سے نہ آؤں۔ پھر کیا کروں گا میں؟ کہاں جاؤں
گا میں۔

اسے اپنا آپ شدت سے بے کار اور غیر مفید محسوس
ہوتا۔ اس درجے میں کہ اسے گھیر لیتی۔ کہ وہ سچیدگی

سے خودکشی کے متعلق سوچنے لگتا۔ کئی بار وہ گاؤں کو
دوسرے قریبی گاؤں سے جدا کرتی اس شفاف ندی کے پاس
پاس جا کر بیٹھتا اور اس میں پاؤں لٹکا لیتا۔ اور
سوچا کرتا کہ اس ندی کی گہرائی زیادہ سے زیادہ کیا ہو
گی۔ آیا اس میں ایک چھوٹے کا نوجوان ڈوب سکتا
ہے یا نہیں۔

پھر جب سورج ڈوبے لگتا اور آسمان کی سرخیاں
ندی کے پانی کو سونے جیسی رنگت بخشتیں تو وہ اٹھتا

اور تھکے ہارے قدموں سے چلتا ہوا دریا خان کے گھر
روح کرتا۔ دریا خان بھی عجب آدمی تھا، نہ اس نے کبھی

اس کے آئندہ کے ارادوں کے متعلق جاننے کی کوشش
کی، اور نہ جیلوں بھانوں سے اپنے گھر کا حدود اربعہ

جتایا۔ یعنی اپنے متعلق وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زندگی میں
پیدا ہونے والی سر تبدیلی کو وہ اس طرح سے قبول کرتا

تھا۔ جیسے یوں ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ ایسے ہی رہے
گا۔ احسن کو اس نے بڑی کشادہ دلی سے اپنے گھر میں

ہمیشہ کے لیے رکھ لیا تھا۔

لیکن احسن جیلانی، دریا خان کے الگ تھا، سر لحاظ
سے الگ، زندگی میں پیش آنے والے نئے واقعات

اسے بے طرح ڈھکے چھپاتے تھے۔ جو ایک عجیب اور نئے
واقعہ تھے اسے نہ صرف دسرب بلکہ خوف زدہ بھی کر دیا۔

اس شام نہ سلیمہ تھی نہ شمیمہ۔ دونوں اپنی کسی پہلی
کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ سلیمہ کو اکیلا دیکھ کر اس

کا ہمیشہ آف رہنے والا نمود مزید آف ہو گیا۔
”آپ پر کھیں گی؟“ اس نے قدرے اکتاہٹ

سے پوچھا تھا۔

”جی ماسٹر صاحب!“ وہ مسکرائی۔ ”آپ بیٹھے نار“
”آپ کی بہنیں پیچھے رہ جائیں گی۔“

وہ دل سے چاہ رہا تھا کہ وہ بھی چھٹی کرے تو اس
کی جان بخشی ہو جائے۔

”دفع کریں جی۔ ان کم بختوں کا کب دل لگتا ہے
بڑھائی میں۔ میں ہی زبردستی کرتی ہوں ان کے ساتھ۔“

”تو جی آج بھی بڑھائی کی اور کل بھی۔“
”بہتر۔“ وہ بھٹ گیا۔ ”کل کا کام پورا ہے آپ کا؟“

”جی۔“ چینگ گراؤں؟“
”کرائیے۔“ اس نے بھون پر آنے والی مسکراہٹ

پتہ منہ کا اندازہ لگاتے ہوئے اس سے خوف کراتے آج
آپ جی جی نہ رہا کریں اپنی عقل کر سنیں یہ گریہ
اتنے کی کہ آپ جتنے بڑے رہے ہیں۔
اس سے ذلتنا لب بھیجی ہے اور نظر ہیکلی۔

میں یہ لالہ کا کہہ گئے۔
اس کو کام دیکھ کر اسے اگا کام سے کردہ اپنے
سائنہ لائی ایک کتاب لکھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کام
آپ سستی سے کرتی تھیں کہ اسے خود کو بوریات سے بچانے
کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب سائنہ رکھتی پڑھتی تھیں۔
ماسٹر صاحب - دوبارہ دیکھا گیا۔
میں نے انہی نے نظر اٹھائی۔

ایک بات پوچھ لیں گی۔ ناراضی نہ ہو میں تو یہ کہہ چکا ہوں
"پوچھیے!" اس نے گہرا لہجہ میں خارج کیا اور کتاب
بند کی۔

یہ یہ جی۔ محبت کیسے ہو جاتی ہے؟
ادھ کاٹو۔
اس کا سہارا میں ہی بیٹھ کر رہ گیا۔
حامی رنگ لے لے دوئے کا کونا دانوں میں دبے
وہ بڑی لگن سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میں کل آؤں گا پھر جانک اٹھ کھڑا ہوا۔ میری
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
"سنئے جی۔ سنئے۔"
وہ اس سے پہلے دروازے تک پہنچ گئی۔

"جلید لانی ایک کر رہی ہیں آپ۔" اس نے راہ میں
کھڑی اس جاہل، بند و لڑکی کو بے بسی سے دیکھ کر
ادھر اُدھر دیکھا۔ "کوئی آدھرا نکلا تو۔"
"اوہ۔ کوئی نہیں آتا ماسٹر جی۔ آپ اتنے بزدل
ہیں میری بات تو پوری سن لیں نا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ بیچ کر بات کریں۔"
راز سے میں کھڑے ہونا اسے اس قدر آگے بڑھ
لگ رہا تھا کہ مجبوراً واپس بیٹھنا پڑا۔
"ماسٹر جی! آپ اتنے خوب صورت ہیں میرا تو دل
مل گیا ہے آپ سے۔ آپ یہ بتائیں، میں اچھی لگتی ہوں

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

میں نے یہ لگتی تھی۔ ایک مختصر مہینہ گزرا
میں نے اس وقت کیچکہ اگر سو رہا۔

ہے ان خالی دماغوں میں : دو دلوں کی داستان : پھر اسے یکایک زور سے ہنسی آئی۔

نائب اکمل باسیروں محترمہ نے یہ فلم دیکھی ہوگی اور دنیا انہیں خیال آیا جو نکاح نہیں تھی تو ایک ہیرو ہیروئن کا تھا ہے۔ جسے انہوں نے اپنی زندگی کا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ سوچتے سوچتے اسے کافی رات بیت گئی۔ اس نے افسانے سے وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجروح ہوا تھا بلکہ فزوق بھی ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی بہت عام سی سیکن ہینال ایک لڑکی تھی۔ صنف نازک۔ جو اسے تودے بے زار یا کسی بھی مشکل میں بہت آسانی سے بچنا سکتی تھی۔ اس کے ذرا سے اشارے پر چوبلی کے خونخوار ملازم اس کی تیکابولی کر سکتے تھے۔

رات کی فضاؤں میں رچی خنکی کے باوجود اس کا وجود گرم ہونے لگا۔

اور عام تو وہ صرف اپنی شخصیت میں تھی۔ دو سترے پہلو سے دیکھا جاتا تو وہ ایک بڑے زمیندار کی لاڈلی صاحبزادی تھی۔ احسن جیلانی کو اپنا آپ ان دیکھے پھندوں میں الجھنا نظر آیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب اسے بڑی احتیاط سے کام لینا ہے۔ اسے دو سترے روئے سے کام لینا ہے تاکہ اس لڑکی کو اپنے ہونٹوں کے چاہنے کا احساس ہو اور نہ ہی وہ کسی خوشحال گھرانے میں پیدا ہو سکے۔ اسے علم تھا کہ زیادہ سنجیدگی سے کام لینے کا نتیجہ قدرے الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے شعور لڑکی سے اسے کسی قسم کی اچھی امید نہ تھی۔

”بہر حال ایک کروڑ لے کر اسے سوچا۔“ میرا دل بھی صاف ہے اور ضمیر بھی۔ خدا میری مدد کرے گا۔“

پھر اس نے آسمان پر پھیلنے سفید یوں کو دیکھا اور ہیکے میں منہ دبا کر سو گیا۔

اگلے دن اس نے کمال خدائی سے چھٹی ماری اور کہا بھیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ اس لڑکی کو اکیدے میں بڑھانے کا خطرہ مول لینے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ کل اظہار عشق کیا تھا۔ آج مزید کیا کچھ کہتی؟ اسے خبر نہ تھی۔

اور وہ شاید قبولیت کی کھڑی تھی جب اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ گھڑا تھا۔ شام اُنہی نے تک وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہو گیا۔

دریا خان کی بیوی نے ایک بڑی محبت کرنے والی بہن کی طرح اس کی تیمارداری کی اور دونوں بہن اس کے پاس بیٹھی رہی اس کا سر دباتی رہی اور مائیں پڑھتی رہی اس پر دم کرنی رہی۔

اور احسن جیلانی نے سوچا کہ دریا خان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ اگر وہ اس فرشتوں جیسی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی کو محض ان پڑھ اور سکاؤں کی لڑکی سمجھ کر چھوڑ دیتا اور اس کی ماموں زاد بہنوں جیسی کسی شہر کی لڑکی سے شادی کر لیتا تو اس کا یہ گھر فردوس کدہ کے بجائے جہنم کدہ بن جاتا۔ ٹھیک ہو جانے کے بعد نہادھو کر اس نے سب سے پہلا کام چوبلی جانے کا کیا۔ چاروں کی چھٹی کے بعد اس کے ذہن سے جلیبہ کی باتیں بھی کافی حد تک محو ہو گئی تھیں اور اب اس کی کم عقلی پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔

چوبلی کے مرکزی گہٹ کا کھٹکا کھولا اور صحن عبور کر کے بڑا آمد سے ٹک جا پہنچا۔ آج ساری چوبلی سوئی سوئی خاموش خاموش سی لگ رہی تھی۔ صحنوں کی نرم و صوب صحن اور آدھے برآمدے میں بھی سوئی تھی۔ بڑے بڑے گول ستونوں پر بلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جن کے سر پر پتے چمکدار اور خوشنما لگے رہے تھے۔

وہ چوٹک کر مڑا۔ سامنے سوہتی کھڑی تھی سرخ اور سیاہ چیمڑی کا دوپٹہ ماتھے تک اوڑھنے، نظریں جھکائے وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

”جی۔“ اس نے ایک نگاہ اس کی پلکوں پر ڈالی۔

”کیا بات ہے؟ آج چھٹی کرنی ہے؟“

”جی۔ نہیں۔ وہ۔“ اس نے چاروں جانب دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔

”اطمینان سے بتائیے کیا بات ہے؟“

”آپ۔ آپ۔ اندر چلیں۔“ اس نے پھر بے چینی سے اوجھڑا دھڑ دیکھا۔

وہ بے حد گھبرائی ہوئی، خوف زدہ سی لگتی تھی۔

”چلیے۔“ اس کی حالت دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ وہ اسے گول کمرے میں لے آئی۔ وہ یوں بھی روز یہاں آنے کا عادی تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب کہ وہ قدرے فاصلے پر کھڑی رہی جیسے اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہو۔

”جی بی بی۔ کہتے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا کیا بات ہے کیا جو بی بی کے لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں؟ اتنی خاموشی کیوں ہے۔“

”جی۔ وہ سب۔ بڑے چچا کی جو بی بی گئے ہیں پندرہ دنوں کے لیے۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”اچھا! لیکن کیوں؟“

”ان کے چھوٹے بیٹے کی میت ہو گئی ہے۔ اسی لیے سب کو اچانک ہی جانا پڑا۔“

”اوہ۔“ چچا نے سب سے بات کہی لیکن آپ یہ سب مجھے باہر ہی بتا دیتیں تو بہتر تھا۔“

”ماسٹر جی۔ آپ۔ آپ۔ اتنے دن مجھے پڑھا دیں گے؟ اس نے انتہائی عاجزانہ درخواست کی تھی۔“

”اس نے چونک کر اسے دیکھا۔“

”آپ کو؟“ اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا تھا۔

”لیکن کیوں؟“

”کیوں؟ اس لیے کہ میرا بھی پڑھنے کا دل کرتا ہے۔“

”آپ نے اپنے مالکوں سے اجازت لے لی ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”مالکوں نے؟“ وہ حیرت سے تعجب سے بولی تھی۔

”کون مالک؟“

”میرا مطلب ہے۔ بڑی سیکم صاحب۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”ماسٹر جی! اس بیان تو کرائی نہیں ہوا؟“ وہ یکدم اس کا مطلب سمجھ گئی۔ ”ہیں۔ میں ان لوگوں کی سگی ماں جانی کی بی بی ہوں۔ خالہ میں وہ میری۔“

”اوہ۔ کہا واقعی؟“ اسے شاک لگا تھا۔ تو پھر۔

”میرا مطلب ہے اتنا فرق کیوں ہے؟ آپ کے رہن سہن اور آپ کی خالہ زاد بہنوں کے رہن سہن میں۔“

”اس لیے کہ شاید جو کچھ مجھے آپ نے سمجھا وہی یہ سب لوگ بھی سمجھتے ہیں۔“ سوہنی نے انسر دگی سے سر جھکا لیا۔

”وہیں خالہ کی اس بہن کی بی بی ہوں، جو ان کی طرح اتنے بڑے آدمی سے نہیں بیانی تھی، بلکہ ایک چھوٹے، عزیز ڈرائیور کی بیوی تھی، میری ماں مر گئی تو ابانے دوسری شادی کر لی۔ خالہ مجھے سوئیلی ماں کے ظلم سے بچانے کے لیے تو یہاں لے آئی ہیں۔ لیکن انہیں اپنے اور اپنی اولاد کے سلوک نظر نہیں آتے، شاید اسی لیے

انہیں احساس نہیں ہوتا۔ کہ میں سب سے آخر میں ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں۔ اور ان کی بیٹیوں کی آسٹرن پینٹی ہوں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ مجھے اتنا کام کرتا دیکھ کر ہمارے سارے لوگ مجھے نوکرائی سمجھتے ہیں۔“ اس کی آواز رورہ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

”بہت افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر لیکن سوہنی بات صرف اتنی ہے کہ کوئی نہ تو اپنی صورت خود بنا لے اور نہ مقتدر۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ اس کو بہت کرکھی آپ ان تینوں سے علیحدہ اور منفرد لگتی ہیں نہ وہ اپنی صورت آپ جیسی کر سکتی ہیں اور نہ آپ اپنا مقتدر ان جیسا۔“

اس کا انداز اور اس کا لہجہ بالکل ساوہ اور بے ریا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے انتہائی مجلسانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

سوہنی نے جلدی سے سر ہلایا اور آنکھیں صاف کر لیں۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا ملتا ہے، آپ سے تو مجھے پس آنا کتنا تھا کہ ان پندرہ بیس دنوں میں آپ مجھے بتنا پڑھا سکتے ہیں۔ پڑھا دیں۔ بالکل کوری ہیں۔ ماسٹر صاحب۔ جو کچھ آپ نے میری بہنوں کو سکھایا ہے۔ وہ سب بے آواز ہے۔ میں۔ میں اکثر یہاں پر دے کے چھپے سے وہ سب سیکھتی رہتی ہوں۔ جو آپ انہیں سکھاتے ہیں چھپ کر، جو یہی ہے ان کی کا بیان اور سننا میں بھی پڑھتی ہوں۔

وہ خیرانی سے اس کی صورت کو تک رہا تھا۔ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق محض فیشن کی حد تک تھا۔ انہیں دو ہزار کی ٹیوشن کی سہولت حاصل تھی اور جس کا یہ شوق جنون کی حدوں تک جا پہنچا تھا۔ اسے پڑ دے کے مجھے چھپ کر جو یہی کا علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کے لیے خاموش ہو گیا۔

”ماسٹر صاحب۔ آپ میرا یقین کریں جی۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو گا۔“ وہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر بولی۔ ”ان لوگوں کے جانتے ہی سارے ہڈ حرام نوکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ اب ان کے آگے سے ایک دو دن پہلے ہی لوہیں گے۔ صرف چوکیدار اور کھانا پکانے والی ماسی رہ گئے ہیں۔ چوکیدار کو لسنے کی بیماری ہے

نہایت۔ تہ و تنی بھیت بن کر روتی رہتی دھن
 ہوتی پڑ رہتا ہے۔ ماس۔ وہ بے سوچے تو
 شاہی بچے تک سوتی رہتی تہ۔ یہ میں اگر
 آپ آکر صند و تخت پر بیٹھے پوچھیں گے کسی کو کون
 کان نہ نہیں ہوگا۔ مجھے پتہ چلتا ہے۔ میں تو بڑی بڑی
 بی بیوں میں جاتی ہوں۔ یہ میں کوئی اگر میرا
 ذہن ہی کر رہا ہے۔ تو دس دن تہ پتہ تو کسی کو خبر ہی
 نہیں ہوتی ہے۔

اسن نے اسے نور سے دیکھا۔ برش خطبت میں وہ
 انہی کے روتی تہ اسے اس کا ذکر ہی تھی۔ یہ سوتے بغیر
 کہ ماس صاحب ایک جوان۔ تھا۔ جس کی نیت کسی بھی
 لئے بے ایمان بھی ہو سکتی تھی۔ جب کہ اس کی آزادی
 کی منتظر تھی۔

آخر یہ لڑکیاں اس قید خانہ میں کیوں ہوتی ہیں۔ کسی
 کو اپنا چاہا سمجھ لیتی ہیں۔
 رات کو بستر پر لیٹ کر اپنے سوچا تھا۔

”کس قدر تفصیل میں لے رہے ہر بات سے آگاہ کر
 دیا ہے آخر کوئی لکھا ہوا ہے اس کا اور کتنا مانتی
 ہے وہ مجھے نہ دانت لڑکی۔“

لیکن کچھ نہ جاننے کی وجہ سے
 نہ معلوم کیوں اسے دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر اس
 کے بچپن کا اس کی اس کے اندر سے نکل کر سامنے آکھڑا ہوا

تھکا۔ وہ اس جسے اپنے ہیکلوں میں، اپنے کالج میں
 پڑھنے کا اتنی تہائی شوق تھا۔ مجھے کالج میں ٹیوشن کی از حد
 ضرورت تھی، اور وہ دو دو ہزار کے ٹیوشن آفرو دہیں کر

سکتا تھا اور اسی لیے اسے کسی پر دھیسرنے پڑھانے کی
 ہامی نہیں بھری تھی۔ وہ اس جس کے کالج کے خواب
 لڑکھوٹ کر اسی کی آنکھوں میں پوست ہو چکے تھے وہ

کیسے کسی کو پڑھانے سے انکار کر سکتا تھا۔
 دوسرے دن وہ جو ملی پہنچا اور سو سنی کی حسب ہد
 سدھا گول کرے میں پہنچ گیا۔ وہ وہیں موجود تھی۔ اپنی

کافی کھیلے اس کی منتظر تھی۔
 ”ماسٹر جی۔ آپ آگئے۔“ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔
 ”میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی میں سمجھی تھی آپ نہیں

آئیں گے۔ بس مجھے بہلانے کو کل ہامی بھری تھی۔“
 ”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر اس کے

سے بچھ گیا۔ باب میں بسہ کے چہرے پر
 ہوتی تو کسی بھول رہنے کے لیے بھی منہ نہ دلاؤں گے۔
 تو نے بولتا ہوا کہ میں نہیں سکتا۔

”آپ بہت مجھے۔ سڑ صاحب ہیں۔“
 بولے تھے ہنس کر وہ خاموش ہو گیا۔
 ”اے دکھائے۔ کیا کیا کام کر رہا ہے۔“

اس کی کاپی کر رہا اس پر کہ ایک ٹیک کرنے لگا
 اسی دو دن کان پر نظر میں ملے اسے مخاطب کیا۔
 ”سوتی رہی۔ ایک بات کہوں۔ آپ برا تر نہیں

مانیں گی۔“
 ”آپ کی کسی بات کا میں برا نہیں مانوں گی۔ آپ
 نے تو جی اتنا احسان کیا ہے مجھ پر۔ میرا اتنا بڑا شوق پور

کر رہے ہیں۔“
 ”جس طرح کل آپ نے مجھے اپنی تنہائی اور کیسے من
 اس کا اس کا دیا ہے ایسا کسی لڑکے سامنے مت کیجئے تو
 مجھے فرشتہ ہونے کا دکھ نہیں ہے لیکن بہت سے لڑکے

میں شیطان بھی چھپا ہوتا ہے۔ انہیں انہیں محض ہرود
 سے نہیں سچاں سکتے اور لڑکیوں کو تو بہت محتاط ہونا
 چاہیے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نامہ ہی باب۔“

”جی۔“
 ”پر تو مجھے پکا اعتماد ہے جی۔!“
 ”وہ کیوں؟“ ”انکھیں قدر سے بڑھ کر تے ہوئے اس

نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”آپ تو جی۔“ ”آپ سے تو جی رشتہ بنتا ہے میرا۔“
 ”وہ شہزادہ کی لڑکی۔“

”رشتہ۔؟“ ”وہ حیرانی کی حدوں کو پار کر گیا۔ کون
 سارشتہ؟“
 ”وہ جی۔ وہ۔“ ”علیمہ آیا میری بہن لگتی ہیں، تو آپ

ان کے حوالے سے میرے دو لہا بھائی ہوئے نا۔“
 ”ہیں انگلیوں میں دبائے وہ ساکت رہ گیا۔“
 ”پھر وہ حواسوں میں لوٹا۔ کاپی بند کی اور سونے کی

پشت سے ٹیک لگالی۔
 ”کس نے کہا یہ سب آپ سے؟“ ”قدر سدرشتی سے
 اس نے پوچھا تھا۔“

”مجھ سے تو کسی نے نہیں کہا۔“ وہ اس کے انداز پر
 گھبرا گئی۔ ”قسم لیں۔“ ”علیمہ آپا نے مجھ سے بالکل نہیں

کہا۔
 "بھیر۔ یہ بے ہودہ کہو اس کیوں فرمائی آپ نے؟ وہ
 انتہائی طور پر تپ چکا تھا۔
 "وہ۔ وہ تو سلیبہ آپ کو بتا رہی تھیں۔ وہ نرموس ہو
 گئی؟ میں۔ میں۔ وہیں لیٹی تھی، انہیں خبر نہیں تھی۔
 بس ایسے سن لیا میں نے۔
 "کیا فرما رہی تھیں وہ؟ دانت کچکچا کر اس نے پوچھا۔
 "کہ۔ آپ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔
 اپنا تو جی بکا پتا تھا انہیں۔ ہاں آپ کا پکا پتا نہیں تھا
 لیکن وہ کہہ رہی تھیں آپ انہیں بڑی سیٹھی نظر سے
 دیکھتے ہیں۔ اور۔ اور انہیں یقین سا ہے کہ آپ بھی ان
 سے۔ کرتے ہیں۔"

"(وہ کیا کرتا ہوں؟) اس نے بین کاپی پر دے مارا۔
 "وہ۔" اس نے محو کنگلا۔ وہ۔ جی۔ محبت۔
 اس نے دونوں ہاتھوں سے سر محکم کیا اور کائی ویر
 تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اسے حالات کی نگین کا علم ہوتا
 جا رہا تھا۔ وہ لڑکی جلدیہ اسے کسی بھی مشکل میں پھنسا
 سکتی تھی۔ یہ شہر نہیں ایک جھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر اسے
 یہاں کسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تو وہ باخان
 پر بھی یہاں کی زمین تک پہنچ سکتی تھی۔ اور اس کے لیے
 دوست اس کے حسن پر کوئی ایچ آئی وہ جیتے جی شرمندگی
 سے مر جاتا۔

"کیا ہوا ماسٹر صاحب؟" سوہنی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
 "اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 "سوہنی بی بی! جو کچھ آپ نے اپنی آپا کے منہ سے
 سنا وہ سراسر غلط ہے۔ نہ میں اپنے دل میں ان کے
 لیے کوئی جذبہ رکھتا ہوں اور نہ ان کے کسی جذبے کی
 پذیرائی کے لیے تیار ہوں۔ میں ایک سیدھا سادہ سا بندہ
 ہوں، کچھ دنوں کے لیے یہاں آ رہا ہوں، پھر جانے کہاں
 ہوں گا مجھے خود خبر نہیں۔ آپ کی آپا میرے لیے کتنی
 مشکلات کھڑی کر سکتی ہیں۔ شاید انہیں اندازہ نہیں
 ہے۔"

"نہیں جی۔ آپا بہت اچھی ہیں۔ وہ جلدی سے بولی۔
 "بس ذرا مزاج کی تیز ہیں۔ تو کیا ہوا، اکثر لڑکیاں
 ہوتی ہیں۔ آپ جی ان کا دل نہ توڑیں۔"

"اوہو۔ کیا بے وقوفی ہے؟" وہ جھٹکا گیا۔ میں جلدی
 ہوں، اور اب شاید سمجھی نہ آؤں۔
 وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 "مہم ماسٹر جی۔ بہت منہیں جی۔ وہ بوکھلا اٹھی۔
 اور اس کا بازو تھام لیا۔
 اس نے اس کی نگہ رک گیا۔

"دیکھیے اگر آپ چلے گئے تو آپا جو کیدار کو بلا کر پوچھیں
 گی کہ ماسٹر صاحب کیوں نہیں آئے۔ انہیں کتنے دن کی
 چھٹی کا کہا تھا۔ اور جو کیدار انہیں بتا دے گا کہ اسے کچھ
 خبر نہیں۔ وہ تو آپ سے گھر گیا ہی نہیں۔ اور پھر میری
 شامت آئے گی۔ آپا نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ میں جو کیدار
 کو پیغام دے کر آپ کے گھر بھیج دوں کہ پندرہ دن کی
 چھٹی کرنی ہے۔ دیکھیے ماسٹر صاحب! ایسے مت جائیں،
 خفا ہو کر، ناراض ہو کر، میں سچ کہتی ہوں مجھے بڑی مار
 پڑتی ہے۔ حالہ مجھے چھڑی سے مارتی ہیں۔"

اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی
 جھڑی رواں ہو گئی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا
 رہا۔ اس کا بازو سختی سے تھامے وہ اس کے قریب کھڑی
 رہی۔ اس نے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی منظر تھا اور
 اس نے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی منظر تھا اور
 نہ دیکھا تھا۔ اپنا بازو پھیلانے کی کوئی کوشش نہیں بنا
 وہ خاموش کھڑا اسے ہنکاتا رہا۔

بھیرا جانک اسے خود ہی احساس ہوا اور اس نے
 جلدی سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ پھر دوپٹے کے
 پلوٹے آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم۔ حالہ تمہیں چھڑی سے مارتی
 ہیں؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے برسوں کی شناسائی
 رہی ہو۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔
 "لیکن کیوں؟" اسے بے پناہ افسوس ہوا۔
 اس بھولوں جیسی لڑکی کو تو کوئی پھولوں کی پھری
 سے بھی نہ مارتا۔ کیسی سنگ دل بے حس عورت تھی
 اس کی خالہ۔

"بس جی! اس کی زندگی ہوئی آواز نکلی۔ کوئی
 غلطی ہو جائے تو۔"
 احسن نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

”آپ نے کہا تھا لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔“

”یہ کون حضرت ہیں۔“

وہ دلی زبان سے بولی۔

”اوہ۔ اتنا کہا مانتی ہو میرا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”جن کو سب کچھ مانتے ہیں۔ پھر ان کا کہا بھی مانتے ہیں۔“ وہ خود بھی مسکرا دی۔

وہ لمحہ بڑا حسین تھا جب وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ بڑی دیر تک خاموش بیٹھے وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔

اچانک دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔ اس اور سوہنی دونوں بڑا کرکھڑے ہو گئے تھے، سفید کلف کے سوٹ میں آنے والا خود بھی کلف زدہ لگ رہا تھا۔ سالولی رنگت پر چمکتی سفید آنکھیں عجیب سرد مہری کا تاثر دے رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک کھڑا انہیں گھورتا رہا۔ ”سوہنی۔“ پھر وہ غمراہ ”کون ہے یہ۔ کیا کر رہی ہے تو یہاں؟“ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟

”مجھے احسن جیلانی کہتے ہیں۔“ وہ سنبھل کر بولا۔ ”پڑھانے آتا ہوں ان لڑکیوں کو پچھریوں ان کا۔“

”سوہنی سے بچ کر کہہ دینا کہ میں آتا ہوں۔“ وہ استغراب سے منہ کر کے بولی۔ ”نہیں چھوٹے سائیں۔ میرے لیے نہیں۔ بڑی بہنوں کے لیے۔“ سوہنی کی حالت غیر محقق ”وہ سب لوگ بڑی جوبلی گئے ہیں۔ چچا بچل کے اپنے انتقال ہو گیا ہے اس لیے۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ کر بولا ”ٹھیک ہے ماسٹر اب تم چھٹی کرو، سوہنی میں اوپر کمرے میں ہوں کھانا لے کر آ جانا۔ ذرا جلدی۔“

پھر اس نے ایک نگاہ غائرانہ احسن پر ڈالی اور مڑ کر باہر نکل گیا۔

”ہائے میرے رب!“ سوہنی نے دل پکڑا اور صوفے پر ڈھکے گئی۔

”سوہنی! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے! وہ پریشان ہو گیا۔“

”اب کہاں خیریت۔ دیکھا نہیں آپ نے ماسٹر جی؟“ چھوٹے سائیں تو سب کچھ کہہ دیں گے خالہ سے، یا اللہ میری کم نصیبی سے آپ پر کوئی مصیبت نہ آجائے۔“

”یہ چھوٹے سائیں ہیں۔ بابا کے بہت قریبی دوست کے بیٹے۔ اماں نے اپنا بیٹا بنا رکھا ہے انہیں بہت سخت مزاج ہیں اور۔ اور۔“

”اور۔؟“

”بہت۔“ عیاش طبیعت کے بھی۔ مجھے ہمیشہ بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا خدا میری حفاظت کرنا۔ گھر پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”پھر۔“ پھر سوہنی کیا کرو گی تم؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”آپ جابیں ماسٹر جی۔ خدا آپ کی حفاظت کرے گا۔ میں ماسی کو چمکاتی ہوں۔“

”میں کل آؤں گا۔“ ”نہیں نہیں اب نہیں۔“ چھوٹے سائیں اب یہیں رہیں گے۔“ وہ گھبرا گئی۔

”بے وقوف لڑکی! اب لکیر میں نے آنا چھوڑا تو ہماری پوزیشن مزید خراب ہو جائے گی۔ سب ہی پوچھیں گے کہ چھوٹے سائیں کو دیکھ کر میں نے آنکھوں چھوڑ دیں۔“

”اچھا۔“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اب آپ جابیں۔“

”جانا ہوں۔ تم ماسی کو ضرور جکالینا۔“

”جی۔“ وہ گلوگیر لہجہ میں بولی۔

”احسن نے دروازے پر زک سے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو تھہرے وہ بہت کی طرح ساکن کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔“

”خدا حافظ سوہنی۔“

”خدا حافظ!“ اس کے بھی لب ہلے۔ وہ افسردگی کو دل میں بھرے وہاں سے نکل آیا۔ گھر جانے کے بجائے تہی پر جا بیٹھا۔ اور تادیر وہاں کھڑا پانی کی سطح پر سوہنی کی نقویہ کو اکھڑے اور ڈوبے دیکھتا رہا، اسے احساس ہوا کہ آج تک وہ خود کو کتنا

مجبور، کتنا لاچار سمجھتا رہا تھا۔ اپنے مقدر سے شاکمیتا تھا۔
 تھا۔ اپنی زندگی کو ناکارہ اور غیر مفید سمجھتا تھا۔ اسے
 احساس ہوا کہ دنیا میں وہ ایک اکیلا ہی اس طرح کا مقدر
 لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرح کے سینکڑوں تھے،
 جو اس کے آس پاس ہی آباد تھے، اور ان میں سے ایک
 سوہنی تھی، جو مروت بھی نہیں تھی، ایک کمزور بے بس لڑکی
 تھی۔

جو کیدار نے قدرے حیرانی و پریشانی سے اس کی
 صورت دیکھی۔ پھر اس کا پر اعتماد انداز دیکھ کر دل
 کھول دیا۔
 وہ اندر پہنچ کر برآمدے میں ہی رگ گیا۔ چند روز
 میں سوہنی آگئی۔

”آپ۔ آپ آگئے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔
 ”ہوں۔“ اس نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔
 اس کی آنکھیں سوچی ہوئی اور۔۔۔ غم انگیز
 ”میرا خیال ہے اب آپ کو نہیں آنا چاہیے۔“
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، چلو اندر چل کر بیٹھے
 بیٹھو۔“

وہ سوچا رہا اور کڑھتا رہا۔ چھوٹے سائیں کا فطرت
 وجود اور سوہنی کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے
 پروسے پر کھینچتی سکتی رہی۔

”گھر پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

کس درجہ لاچاری سے اس نے کہا تھا۔

”اور میں اسے اکیلا چھوڑ آیا۔ اس چھوٹے سائیں

دونوں گول کمرے میں آگئے۔

”چھوٹے سائیں کہاں ہیں؟“ اس نے بیٹھے ہوئے

کے ساتھ، اس نے مٹھوڑے سے مٹی اڑائی۔

”لیکن میں کرکھی کیا سکتا تھا۔ کیا لگتا ہوں میں اس

کا، مجھ سے زیادہ تو شاید وہ چھوٹا سائیں اس پر اپنا

”اوپر۔ اپنے کمرے میں۔“

”تم روتی ہو؟ کیوں؟“ اس کا دل بے چین ہونے

سکانی دیر وہ وہاں کھڑا کڑھتا رہا پھر شکستہ قدموں

سے گھرنٹ آیا۔

”ہیں۔ زندگی کے ہر لمحہ میں ہارتا ہی رہا ہوں۔“

نامراد ہی رہا ہوں۔ اس نے کبھی نہ سوچا۔ لیکن

اس بار نہیں۔ لہجہ میں زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکا

تو کیا ہوا۔ سوہنی، جس نے نہیں کھوؤں گا، کبھی بھی

نہیں۔“

دوسرے دن وہ بڑے اعتماد سے وہاں پہنچا تھا

چھوٹے سائیں کے آنے کا سب سے پہلا اثر تو یہ ہوا تھا

کہ بڑے گنٹ پر جو کیدار موجود تھا۔ بغیر کسی نشے کے بڑا

مستعد اور خوش را۔

”سلام ماسٹر صاحب!“

”وعلیکم السلام۔“

”سب لوگ بڑی جلدی گئے ہیں صاحب۔“

”انفارمیشن سروس بڑی کوٹیک ہے آپ کی۔“ وہ

مسکرایا۔

”جی، کیا کہا صاحب؟“ اس کے خاک پلے نہ پڑا۔

”ایسے بھائی۔ میں ان کو نہیں سوہنی بی بی کو ٹھکانے

کر رہا ہوں۔“

”لوٹناں کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی ہے، لیکن

ہمیں اسے بھائی۔ میں ان کو نہیں سوہنی بی بی کو ٹھکانے

کر رہا ہوں۔“

”لوٹناں کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی ہے، لیکن

ہمارے کردار پر کوئی کیچڑ نہ اچھلے، یہ زیادہ بہتر ہے۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ بڑے بڑے ہیں۔“

”اور اب یہ بناؤ کہ غم اتنی پریشان کیوں ہو، تم روتی کیوں ہو۔ کیا چھوٹے سائیں نے کچھ کہا ہے؟“

وہ مختصری دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بولی۔

”چھوٹے سائیں، خالہ سے میرا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔“

”اوہ۔“ وہ ساکت رہ گیا۔

”مبارک ہو۔“ پھر وہ خود پر قابو پا کر پھیکے سے لہجے

میں بولی۔

سوہنی نے ملا متنی انداز میں اسے دیکھا۔

”کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں، ایک پیچھے

سے نکل کر یقیناً زندگی کاٹنے کے لیے دوسرے پیچھے

میں جانے کی بات ہے۔“

”وہ بڑے آدمی ہیں، نہیں پسند کرتے ہیں۔“

”جی ہاں، یقیناً خوش بھی رکھیں گے۔“

”جی ہاں، وہ بڑے آدمی ہیں۔“

”مجھے شے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں کو پسند کر چکے ہیں۔“

”ان میں سے تین کو نکاح کر کے چائیکے ہیں، اب مجھے

کمر جائیں گے۔ یقیناً کچھ دن خوش بھی رکھیں گے۔“

”میں سوں کی اور میرا سیاہ مقدہ چھوٹے سائیں کو

ایک مقام پر رکھنے کی عادت نہیں۔“

”وہ استہزاء کی سی محنتی تھی۔“

”نہیں۔ نہیں سوہنی۔“ وہ غصے سے اٹھ اٹھا۔ ”ایسا نہیں

ہونا چاہیے۔ تم ایسی پیاری لڑکی اس شکر کو کی۔“

”نہیں۔ تم کسی کے چند روزہ بہلاوے کا سامان بنو۔ ایسا

نہیں ہو سکتا۔“

”کیا کریں گے آپ، وہ بڑے دکھ سے بولی تھی۔“

”اگر میں۔ میں بیگم صاحبہ سے تمہارا ہاتھ مانگوں

تو۔“

وہ ہولے سے ہنس دی اور خاموش رہی۔

”لو سوہنی۔“

”مجھے سے ایسا سوال کرتے ہیں جس کا جواب آپ

خود جانتے ہیں۔ خالہ اپنے منہ لوٹے بیٹے پر ایک

اجنبی شخص کو کیوں فوقیت دیں گی۔ اور میرا ہاتھ مانگ

کر تو آپ خود بھی قابل شک تمہیں گے اور میں بھی

اور حلیمہ آپا۔ وہ تو مجھے جان سے مار دیں گی۔“

”لیکن ایسے بھی تو خاموش نہیں رہا جاسکتا اس

نے بے چینی سے پہلو بدلا۔“

سوہنی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن اسی

لمحے حبابی قدموں سی آواز سنائی دی اور چھوٹے سائیں

نے اندر قدم رکھا۔

دونوں خاموش ہو کر کنبوں کی جانب متوجہ ہو

گئے۔ سوہنی کا پی پر آڑ کی تر بھی لائیں کھینچنے لگی۔

چھوٹے سائیں نے چند لمحے اندر کا ماحول دیکھا

پھر آکر کونے میں بیٹھنے سے پہلے کمر اخبار پڑھنے

لگے۔ واضح طور پر وہ ان دونوں کو تنہا دیکھ کر مشکوک

ہوا تھا۔

”حسن نے مختصری دیر اسے پڑھا یا پھر اٹھ کھڑا

ہوا۔“

”اچھا سوہنی بی بی! آپ باقی کا کام کر لیجے گا۔“

”میں کل آکر چیک کر لوں گا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ حسن نے ایک تیز

کڑی نگاہ کونے میں بیٹھے اس اوٹا میں صفت شخص

پر ڈالی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا نکل گیا۔

”اچھا سوہنی! اس کا دل ساری دنیا کو تنہا نہیں

کر دینے کو چاہ رہا تھا۔ اس کا وجود کتنا حقیر اور

بے معنی تھا، درحقیقت آج اسے اس بات کا۔“

”حسن۔ وہ چھوٹے کا لمبا چوڑا انجان کچھ نہیں تھا۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے یقیناً جی نہیں کہ کسی مظلوم، بے سہارا

لڑکی کو حالات کے ظالم مگر محبہ کا نوالہ بننے سے بچا سکتا،

اس کا ہاتھ طلب کر سکتا۔ اسے اپنا نام دے سکتا،

بھلا کتنی اہمیت کا حامل تھا اس کا نام۔ غصے کی

شدید لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

”اتنا غیر اہم، اتنا بے کار، اتنا بے مصرف۔“ اس نے

درخت کے تنے پر مکے برس برس کرنا پناہ کھتہ زخمی

کر لیا۔ ”کیوں ہوں میں اس دنیا میں۔ کیا کرنے آیا

ہوں۔“ نقد پر کی ستم طریقوں پر اس کی آنکھ کھر

آئی۔

”پہلے تنہا اپنے دکھ جھپٹا تھا، اپنے زخم ستیا تھا،

تو درد اتنا شدید نہ تھا۔ اب اس درد میں کسی اور

کی آہیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اور میں۔ میں اپنے

لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تو اس کے لیے کیا کروں گا، ایک

بے روزگار، غریب نوجوان کیا دے سکتا ہے ایک لڑکی کو۔ چھوٹے وعدے، کمزور تسلیاں۔ جہنم وہ اپنے پلو سے باندھ کر اس عیاش امیر کے ساتھ رخصت ہو جائے گی۔ زندگی بھر جلتے اور کڑھنے کے لیے۔ اور ایسے ہیں میرے تصور سے اسے کسی کمراسیت، کتنی نفرت محسوس ہوا کہ اسے کی۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے، ایک مرد جب کسی مظلوم لڑکی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے تو کون سی خوشی بخش سکتا ہے اس کا تصور! لڑکے چھوٹے، مجروح خیالات لیے شکستہ دل سنبھالے وہ بوجھل قدموں سے گھر لوٹا تھا۔

چلتی پرزہ ہوتی ہیں۔ شکل سے معصوم، اندر سے پورے پڑھ جائیں تو اور مصیبت کھڑی کرتی ہیں۔ اور ویسے بھی اماں نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ ذرا چاہا سائیں گے بیٹے کا چالیسواں ہو جائے تو اماں اس کا نکاح کر دیں گی۔ اچھا دیکھا بھالا لڑکا ہے، اپنے ہی گھر کے لیے اس نے خون کے کئی گھونٹ بھرے۔

”آپ۔ کیسے رہے اتنے دن ماسٹر صاحب؟“

”نہیں پیار بھرے لیے ہیں پوچھا۔“

اس نے تلخ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر میز پر مطلب سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی تاہم کی۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔ اب آپ لوگ کیا بیان کھولیں۔ تو کچھ پڑھائی ہو جائے۔

”میں نہیں پڑھا کر مزید کرنے کے لیے کام دے کر وہ سیدھا ہوا تو چائے کا کپ اس کے سامنے آ گیا۔“

”ماسٹر صاحب! چائے۔“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ منورم آنکھیں سرخ ناک۔ اسے اپنی جانب دیکھا۔ بائیں ہاتھ نے دانتوں سے

آہستگی سے کہہ کر اس نے کپ پھاما اور پھر رک گیا۔ اس کی کلائی پر نیل پڑا ہوا تھا۔ واضح، لمبا اور گہرا نشان۔ اس میں جلائی ہوئی ایک انڈر آبال آکھنے لگے۔ اس کا جی ہلکا ہوا۔ اس نے کپ کو ہاتھ سے اٹھا لیا اور اسے کھینچا۔ اس نے جہنم کے سے باہر لے جائے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی حق اس کے پاس نہ تھا۔ سو وہ چائے کا کپ مقام کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ہاں خود سے بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ گرم گرم چائے لیے لیے گھونٹ بھر کر اندر آباری اور جلتے ہوئے دل کو مزید جلادالا۔ بنانے کیوں وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر آہستگی سے مڑ گئی۔

وہ انتہائی غصے کے عالم میں بیٹھا رہا، بات بے بات لڑکیوں کو ڈانٹتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی، اس کی جانب پشت کیے تھے۔ صحن سے یکے فرس کو گھور رہی تھی۔

”رات آٹھ بجے۔ ندی کے کنارے!“ اس نے سرگوشی

دوسرے دن وہ حویلی پہنچا تو حلیمہ، سلیمہ اور شمیمہ اس کی منتظر تھیں۔ لیکن کچھ تناؤ زدہ چہروں کے ساتھ۔

”السلام علیکم۔ آگئیں آپ لوگ۔“ اس کا بھٹا ہوا دل مزید بھج گیا۔

”سوہی کو نہ دیکھنے، اس سے نہ ملنے کا تصور کیا جا لیا تھا۔“

”جی ماسٹر صاحب! حلیمہ نے لب کشائی کی، اور آپ کو اس پر تمیز لڑائی نے نہیں بنایا تھا کہ ہم نے آپ کو نپٹے دن چھٹی کے لیے کھانا کھانا کیا تھا۔“

”جی۔“ وہ بوجھ میں لڑکی۔

بنانے سوہی نے ان لوگوں سے کیا کہا ہوا تھا ایسے ہیں اس کا کوئی بیان نہ ہو سکتا تھا کہ بے مزید پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔ اور اس کی ٹھیکری سے مار پڑنے کا سوچ کر وہ مزید خاموش ہو گیا۔

”رفع کریں ماسٹر صاحب! پریشان نہ ہوں، حلیمہ اسے پریشان دیکھ کر بولی۔“ وہ میسجی ہے ہی ایسی۔

”آپ کی منتیں کی بھین نا، اس نے کہ اسے پڑھا دیا کر کیا سب بنا دیا ہے اس نے۔ کم بخت کو اتنا خیال نہ آیا کہ اماں سے پوچھ کر یہ شرکت کرتی۔ خیر آپ دل بردانہ کریں۔ آپ کا بھائی کیا تصور آپ کا تو کام ہی پڑھانا تھا۔“

”اگر۔“ انہیں بھی پڑھنے بکھنے کا اتنا شوق ہے تو آپ لوگ ساتھ بیٹھا لیا کریں ان کو بھی۔“ وہ نڈبے مخاطب لہجے میں بولا۔

”جی۔“ اسے نہیں پڑھانا لکھانا، سلیمہ نے سخت سے ناک سمجھوں جہد مائی۔“

”بہن ماں باپ کی لڑکیاں پڑھیں۔“

خود کو پہلے ہی کم مایہ سمجھتا ہوا، اس کی قیمت پوچھی جائے۔
تو وہی حال ہوتا ہے جو احسن جیلانی کا ہوا۔ وہ بیسے
انگاریوں سپہ لوٹ گیا۔

سوہنی۔ سوہنی میں شادی کروں گا تم سے۔ اپنا نام دوں گا، اپنی محبت دوں گا۔ اور تمہیں دینے کے لیے محبت میرے پاس واحد شے ہے۔ مجھے اس بات کا اتنا ہی دُکھ ہے۔“

”مجھے آپ سے محض اسی شے کی آرزو ہے۔ باقی سب
مٹی ہے، فانی ہے۔ لیکن ماسٹر صاحب! یہ ہونا ممکن نہیں
تو نہیں۔ کچھ دن بعد تو میرے نکاح کی تاریخ بھی طے
ہو جائے گی۔ ہمارا ملنا تو ناممکن ہے۔ بھانے میں کیوں
چلی آئی۔“

وہ اچھی مگر احسن نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام

”نہیں سوچنی! اسے مت جاؤ۔ ابھی ہیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ بہت سی منصوبہ بندیاں کرنی ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔“

ہدایت الیوم

”بہی تو سوچنا ہے۔ تم بیٹھ جاؤ لیکنز۔“
وہ کش مکش کا شکار بھی تھا مگر بیچے گئی

”پہلے یہ بتاؤ۔ یہاں اگر دیر ہو گئی تو تم کسی مشکل کا
شکار ہو رہے ہو جاؤ گی۔“

”میں نے جو کیدار کا آپ کو تباہی کا کہہ دیا۔ وہ نشہ کا عادی ہے، مجھے اس کی کوئی ٹھوس خبر نہیں ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی کا کھانا کھانے میں گزار دیتا ہے، وہ صبح تک اونگھتا رہے گا۔“

میں تمہیں کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا —
میں ایک بالکل اکیلا، بے مدد غریب آدمی ہوں، ماں
باب کب مرے، مجھے خود علم نہیں، بچپن سے خود کو اپنے

ماموں کے گھر پایا۔ مامی مزاج کی تیز ہیں۔ انہیں میرا
وہاں رہنا پسند نہ تھا۔ ماموں کے حالات بھی کچھ فاضل
نہیں تھے، میں سرکاری اسکولوں میں پڑھ پڑھ کر بڑا ہوا
تعلیم غیر معیاری تھی، سوا چھٹی نوکری بھی نہ مل سکی۔ دریا خانا

یہ حنفیہ کہ اس نے ایک سادہ سوال ہی پوچھا تھا۔
لیکن آسن جیلانی کے لیے یہ ایک بہت بڑا طعنہ تھا۔ جو

نے تمہاری حالت سے میرا ذکر کیا ہوا تھا۔ اس کے بلانے پر میں نے ماموں کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور یہاں چلا آیا۔ اب میرا تو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ نوکری میرے پاس ہے نہیں۔ یہاں بیوشن پڑھا کر خبر روپیہ جمع کیا ہے وہ ضرور میرے پاس ہے لیکن وہ بھی ناکافی ہے ایک زندگی شروع کرنے کے لیے۔ تم بتاؤ ان حالات میں تم میرا ساتھ دینا چاہو گی یا نہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ تم پر کوئی زبردستی کوئی جبر نہیں۔ سوچنے کے لیے مہلت دو کار ہونے اس وقت تم والیں جا سکتی ہو۔ باقی بات کل باپریوں کر لیں گے۔

”مجھے ایک لمحے کی مہلت بھی دو کار نہیں۔ میں آپ کا ساتھ اپنی خوش نصیبی سمجھ کر قبول کروں گی۔ لیکن کس طرح؟“
”گھر چھوڑ کر چلو گی میرے ساتھ؟“
وہ بڑی دیر سے بے خاموش ہو گئی پھر اس کی لیلیٰ آواز نکلی۔

”یعنی۔ یعنی یہ بھال کر؟“
”ہاں۔“ وہ سستہ لہجے میں بولا ”ہمارے پاس دو سڑا کوئی راستہ ہے۔“
”کم از کم تمہاری طرف سے میرے لیے اس گھر سے لپکنا ہی ہے۔“ لیکن ہم کہاں جا رہے تھے؟ اس کا مدافعتی لہجہ انتہائی کمزور تھا۔
”اللہ کی زمین بہت بڑی ہے سوہنی۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا۔“
”ہم کسی خود بصورت سی جگہ پر شروع کریں گے؟“

”اور۔ اور۔ اگر بیکریے گئے تو جو اس نے تھوک لگا۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو چکی تھی۔“
”ہاں۔ یوں تو قسمت اب تک ایسی رہی ہے کہ آئندہ بھی کچھ زیادہ خوشگوار نظر نہیں آتی۔ لیکن آزما لینے میں کیا خرچ ہے؟ کم از کم دلوں میں ملال تو نہ رہے گا کہ تم نے کوئی شے ہی نہیں کی۔ پکڑے گئے تو قبریں ضرور برابر برابر لپٹیں گی۔“

وہ ہونے سے ہنسنا لگا۔
”ماسٹر صاحب!“

”بولو احسن۔“

”انجینی نہیں۔ ابھی تو مجھے خود پر بھی بھروسہ نہیں۔“

اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم گھر جاؤ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر تمہیں منظور ہوا تو تم پریوں اسی وقت یہیں ملیں گے۔ ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ ایک مجبور لڑکی اپنے ہاتھوں میں بندھی زنجیروں اور پریوں میں پڑی بیٹریاں توڑنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہ تھا۔“

وہ اٹھا اور سہارا دے کر اسے بھی اٹھایا۔

”چلو۔ میں تمہیں حویلی تک چھوڑاؤں۔“

”نہیں ماسٹر جی۔ آپ جائیں۔ میں آتی بھی اکیلی تھی، والیں بھی اکیلی ہی جاؤں گی۔“ آہستگی سے بازو ٹھٹھرا کر وہ رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

بیچ کے دو دن اس نے کس طرح سے کاٹے دی جاسکتا تھا۔ سوہنی کو چھوٹے سائیں سے بچانے کی دھن اس کے دماغ میں بڑی طرح سما چکی تھی۔

تیسری رات وہ آٹھ بجے ہی بیدار چلا آیا۔ سردیاں اختتام پذیر ہو چکی تھیں اور فضا میں خوشگوار سی حدت محسوس ہوتی تھی۔

کافی دیر وہ غائب و گامی کی سہمی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ آئے گی یا نہیں۔ وہ کوئی فیاض لگانے سے بھی قاصر تھا۔ اپنی عزت اس طرح سے داؤ پر لگا دینا کسی بھی لڑکی کے لیے ایک بہت بڑا قدم ہو سکتا تھا۔

وہ اکیلا بیٹھا دنیا کے ہر مسئلے پر سوچتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی جب کوئی آہستگی سے اس کے برابر آ بیٹھا۔

”ماسٹر صاحب! میں آگئی ہوں۔“ سوہنی کی آواز تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس چھوڑا۔

”شک ہے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا۔“

”مجھے نہیں بتایاں ٹھیک کر رہی ہوں یا غلط؟“

”فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار عموماً وقت پر ہوتا ہے سوہنی۔“ وہ بولا۔ ”ہم صرف اچھی امید رکھ سکتے ہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

”میری پوری بات سن لو پھر بولنا۔“ اس نے رسائی

نے کہا: "سنوکل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ نواب شاہ
میں میرا ایک دوست رہتا ہے میں اس کے پاس دو دن
رکوں گا۔ ایسا نہیں اس لیے کرنا ہے تاکہ کسی کو بھی یہ
علم نہ ہو سکے کہ تم کسی کے ساتھ گئی ہو، ورنہ ساری تلاش
آسان ہو جائے گی۔ میں دو دن پہلے چلا جاؤں گا تو کسی
کو یہ خبر نہ ہو سکے گی کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہو،
میں دونوں ساتھ گئے ہیں، کوئی سوچ بھی نہ سکے گا۔
"جی۔"

"منگل کے دن تم صبح چار بجے والی گاڑی میں بیٹھو
گی۔ چار بجے اندھیرا ہوتا ہے، تم چوکیدار کو نشہ دے
دینا اور چادر میں لپیٹ کر حویلی سے نکل آنا۔ اسٹیشن
یہاں سے دس منٹ کے راستے پر ہے۔ صبح کے وقت
پلیٹ فارم بالکل سناں ہوتا ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھ
جانا تاکہ کسی خوف کے۔ وہی گاڑی کچھ گھنٹوں بعد نواب شاہ
سینچے گی۔ میں وہاں سے گاڑی پکڑ لوں گا اور ٹرین میں
مٹیس ڈھونڈ لوں گا۔ ہم کراچی جاؤں گے۔ نکاح کریں
گئے اور وہیں کسی جھوٹے سے علاقے میں چھپ کر
کچھ عرصہ گزاریں گے۔" "لیکن وہ خوفناک زندہ ہو کر
نہ مل سکے تو؟ اگر میں کھو گئی تو؟"

"نہیں سوہنی، ایسا نہیں ہو گا۔ اس نے یقین دلایا
"اسی منصوبے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔"
"اگر آپ گاڑی نہ پکڑ سکے ماسٹر صاحب تو میں
کہاں جاؤں گی؟ مجھے تو نہ زمین پناہ دے گی نہ آسمان۔"
"جی چھوٹا نہ کرو سوہنی، میں ایسا ہرگز نہ کرنا محض
دور باخان کا خیال ہے۔ وہ میرا محسن ہے، میں اسے
سکاوں بھریں ذیل کر کے نہیں جاسکتا۔ پلیئر مری بخوری
کو سمجھو سوہنی۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے ماسٹر صاحب۔"

"پھر تم یہاں آئی کیوں بھتی؟ اسے اچانک غصہ
آگیا۔ "اب بھی واپس جاسکتی ہو۔"
وہ خود بھی از حد نروین اور خوف زدہ تھا۔ ایسے
میں سوہنی کا خوف اس کے اعصاب کو مزید کمزور کر
رہا تھا لیکن جب اس کے ڈانٹنے پر وہ رونے لگی تو وہ
شرمندہ ہو گیا۔

وہ جب سرد ہو کر خوف زدہ تھا تو وہ تو بھر پور
تھتی۔ مزید یہ کہ گھر بھی اسے ہی چھوڑنا تھا۔ شہر
کا خوف بھی اسے ہی زیادہ محسوس ہونا تھا۔
"آئی ایم سوری۔ سوہنی پلیئر، چپ ہو جاؤ، اس
نے ندامت سے اسے پکارا۔ دیکھو میں معافی مانگتا
ہوں۔"
وہ خاموش ہو گئی۔

"میں ڈر تو لگتا ہی ہے سوہنی لیکن جب ہم نئی
زندگی شروع کریں گے تو میں یہ وقت یاد کر کے ہنس
بھی آئے گی، اور لطف بھی محسوس ہو گا۔"
اسے بہلانے کے لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ اور
نئی زندگی کا تصور سوہنی کے لیے پہلی بارش کی نرم
پھیواڑ جیسا تھا وہ کھل اٹھی۔
"دو دن صبح کے آثار نمودار ہونے تک بائیں کرتے
رہے۔ سینے دیکھتے رہے۔ تصور کی دنیا سچائے سنوارنے
رہے۔"

"اچھا سوہنی۔" پھر اس نے اچانک دیکھا اور کھڑا
ہو گیا۔ "خدا نے چاہا تو منگل کے دن میں گئے ہاں! وہ
"جی جی صاحب! اس کی آواز گھڑ گئی۔ "خدا آپ
کا نگہبان ہو۔"

حویلی جا کر اس نے پچھلے صاحب سے ملاقات کی
اور انہیں بتایا کہ وہ بخیر آباد جا رہا ہے، اسے وہاں
کوئی پریشانی نہیں ہے۔

"ماسٹر۔ اچانک کیسے؟ وہ پریشان ہو گئیں۔
"جی بس۔ اچانک لیٹر آگیا اس لیے۔"
"لیکن بچیوں کا کوئی تندرست تو کر جاتے۔"
"دیکھو مجھے میرا ایک دوست ہے اسے بھجوں گا، اگر وہ
راضی ہو تو اس نے مزید ایک جھوٹ بولا۔
"اچھا۔ تم جیسا تو نہیں پڑھتے گا وہ؟ وہ متذبذب
تھیں۔ "لڑکیاں خوش ہیں تم سے۔"
"وہ مجھ سے بھی اچھا پڑھتے گا۔ لڑکیاں اس سے
بھی خوش ہوں گی۔" وہ مسکرایا۔
"اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ اپنے دس دن کی تنخواہ
لے جانا۔"
اسے رد کرنے پر اصرار کرنا انہیں ویسے بھی اپنی توہین

علیمہ سلیمہ اور شمیمہ گھر پر نہیں تھیں۔ وہ جان بخشی ہوئے پر خوش خوش چلا آیا۔

دربا خان کو وہ پہلے ہی بنا چکا تھا کہ وہ نواب شاہ جا رہے سعد حسن کے پاس۔ کچھ دن وہاں رک کر وہ حیدر آباد چلا جائے گا۔

دربا خان عجب آدمی تھا۔ نہ زیادہ سوال کرتا تھا نہ بحث۔ جیسی تمہاری مرضی کہہ کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اسٹیشن پر اسے چھوڑنے آیا تھا۔

بار اول لگتا تھا تیرے ساتھ۔

ہاں۔ ٹھیک کہتا ہے تو۔ لیکن بس دیا۔ دل بھر گیا تھا ان خالی دماغوں سے ابھرا کچھ کر۔ اب حیدر آباد جا کر کوئی سلازمنت دیکھوں گا۔ مل ہی جائے گی۔

اپنا اتنا پتا بھیجنا۔ وہ بولا۔ یہ نہیں کہہ سکتا بھول

بجال کر اپنے صندوق میں گم ہو جاؤ۔

ارے نہیں بار۔ کچھ بھول سکتا ہوں بھلا۔

سعد حسن کو میرا سلام کہنا۔

سعد ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔

ہاں۔ ضرور۔

ٹرین آئی۔ چار منٹ کے لیے رکی اور وہ اس کے

چلنے پر دربا خان سے گلے مل کر لپک کر سوار ہو گیا اسے

یقین تھا اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

سعد اس کا بڑا اچھا دوست تھا۔ بڑی خوش دلی سے ملا۔

بس بار۔ دو دن تنگ کروں گا تجھے پھر نکل جاؤں

کانٹی مشینوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے

بیر کی شاہ کو وہ اپنا بیگ درست کر رہا تھا جب سعد کسی کو لیے اندر آیا۔

”بیجے جناب۔ آپ کے بھی مہمان آگئے یعنی مہمان کے مہمان“

وہ حیرانی سے مڑا۔ سامنے عبدالرحمن کھڑا تھا۔

”ارے عبدالرحمن! تم! وہ اس سے لیٹ گیا۔

وہ اس کا جگر کی دوست تھا۔ اور ساتروں کے ہاں سے ملتے وقت وہ اسی کو اپنا پتا دے کر آیا تھا۔

”بڑا خواہ کیا ہے تم نے؟ وہ علیحدہ ہو کر شکایتی بولا۔

”پہلے دریا کے گاؤں پہنچا، وہاں پتا کیا۔ علم موا جناب تو دو دن ہوئے رخصت بھی ہو چکے۔ یہاں اتنی مشکلوں سے سعد کا پتا کیا ہے۔“

”لیکن ایسی کیا افتاد آن پڑی۔“ وہ ہنسا۔

سی ایس ایس پاس کر لیا ہے۔“

الفاظ تھے کہ سحر چھوڑ گا کیا تھا۔ احسن جیلانی سا کھڑا رہ گیا۔

”کل انٹرویو ہے۔ آج سہرے میں واپس چلنا ہے۔“

لیکن۔ لیکن۔ عبدالرحمن۔ وہ جیسے کوما میں چلا گیا۔

”لیکن کیا میرے بھائی۔ خواہشوں میں آجا۔“ وہ اس کی حالت دیکھ کر ہنستا۔ ابھی انٹرویو میں پاس ہونا

آفسیر احسن جیلانی صاحب!۔“

اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ جیسے وہ سب سن رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”بارہ احسن۔ تو ٹھیک تو ہے نا۔“

”عبدالرحمن۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اسے لے کر قریبی ہوٹل میں چلا آیا اور لفٹ سے

یہ تک ساری داستان سنا ڈالی۔

”اب بتاؤ۔ کہا کروں؟ مستقبل قربان کروں؟“

عبدالرحمن سوچ میں پڑ گیا۔

”معاملہ انتہائی گڑبڑ ہے۔ تم قانون کے محافظ بننے جا رہے ہو اور دوسری جانب ایک بڑا جرم بھی کرنا چاہتے ہو، جانتے ہو لڑکی کو دھکا کر لے جانے کی سزا۔ کون کون

سے منافقات بن سکتے ہیں تم پر؟ پکڑے گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔ اور ان لڑکیوں کا تو کوئی دین ایمان نہیں ہوتا میرے بھائی۔ عدالت میں جا کر حبس بیان بدل رہی ہیں خوشی کر صاف نکل جاتی ہیں۔

”یار سبھے صحیح راستہ سمجھاؤ۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”صحیح راستہ یہ ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین نے آنا ہے، رات دیر سے کراچی پہنچیں گے اور صبح دس بجے تمہارا اسٹروپوے۔ ٹیوٹج لوہے کٹنا بڑا چالس ہے لڑکیاں تو ایک چھوڑ بھڑا ملتتی ہیں، یہاں کامیاب ہو گئے تو زندگی کے سارے سینے پورے ہو جائیں گے، عزت طاقت کیا نہیں ہوگا تمہارے پاس۔ شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی کیسے۔ یار لڑکی بھگا کر لے جائے گا؟ یہ اسٹینڈرڈ ہے بھراؤ۔“

”لیکن۔ لیکن۔ اس کا کیا ہوگا؟ اس کا سانس تیز چلنے لگا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”نواب شاہ شیش پر تم آتے نہیں۔“ وہ تمہیں ڈھونڈنے لگی اور ٹرین میں نہ پا کر اسٹیشن پر آگئی۔ اسٹیشن پر آگئی اور گاؤں چلی جائے گی۔ ایک بار پھر مارا جائے گی اور چھوٹے سائیں کے بیوی بن کر عیش کرے گی۔ دیکھو حسن! میں نے سر پوائنٹ کلیر کر دیا ہے۔ اب تم جو فیصلہ کرو، تمہاری مرضی۔ لیکن ذرا جلد سے لکھنے میں دس پندرہ منٹ ہیں۔ میں اسٹیشن جا رہا ہوں۔ تمہارا انتظار نہ کرو۔ کروں گا۔“

اس کے جانے کے بعد وہ سانس روکے بیٹھا رہا اور اگرچہ ٹھیک کرتا تھا۔ زندگی میں ملنے والا یہ پہلا اور شاید آخری چالس تھا۔ بعد وہ سندر بھٹی جیسے چھوٹے کے لیے وہ ساری عمر ٹپٹا رہا تھا۔ اس کے سینوں کی تعمیریں کراچی وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور حسن جبیلانی اندر سے مگر زور پڑتا جا رہا تھا۔

”اسے سو سنی کا نام اس کا چہرہ عجوبہ بنا جا رہا تھا۔ بنگلہ، کھاری۔ باورچی۔ باورچی کا ڈرائس کی آنکھوں میں گھبراہٹ تھی۔

”شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی سے۔ یار لڑکی بدگماں ہے جائے گا۔ یہ اسٹینڈرڈ ہے بھراؤ۔“

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

ٹرین چلنے سے دو منٹ پہلے وہ اپنا گپ لیے اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔

انے ایس پی بن کر وہ پنجاب آ گیا تھا۔ اور اس کی زندگی کی مذی اس طرح رواں ہوئی تھی کہ کھلی باؤں کے پتھر کہیں اندر سی اندر بیٹھتے چلے گئے تھے۔ اسے صرف آگے بڑھتے چلے جانا یاد رہ گیا تھا۔

سات سال بعد وہ ایس پی احسن جبیلانی تھا۔ درجہ اس کی بیوی بن چکی تھی۔ اور وہ درجوں کا باب تھا۔ معاشرے میں اس کا نام تھا۔ مقام تھا۔ اور اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس نے زندگی سے چاہا تھا۔ زندگی سے اپنے مقصد سے اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ احسن جبیلانی جو بے کار تھا غیر اہم تھا۔ بے نام، بے مقام تھا۔

یادوں کی وضاحتیں دین ہو چکا تھا۔ اور اب جو کچھ وہ تھا اسے خود پر فخر تھا۔ وہ ایک حسین مہکتی رات تھی، ایک بڑے زمیندار کے بیٹے کی شادی کا جشن تھا۔ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ شراب کا دور کھلے تمام چل رہا تھا۔ عام سے جام کے کمرے پر ایک شیش باری اور فائرنگ سے کان پڑیں اور اڑھائی رات ہو گئی تھی۔ سبھی کا شور اٹک چھا ہوا تھا۔ سامنے بنے اسٹیج پر رقص ہو رہا تھا۔ احسن جبیلانی اپنے کسی دوست سے محو گفتگو تھا، تھوڑے بکھرے تھے۔ ایک کسی نے بڑی آہستگی سے شراب ”ڈرنک لیجیے ایس پی صاحب۔“

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی اور پھر اس کی نگاہ ساکت ہو گئی۔ وہ بدلی ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ پہچان نہ پاتا۔ پست بھڑکیلا لباس زیب تن کیے چہرے کو شوخ رنگوں سے سجائے وہ جس انداز میں کھڑی تھی وہ صاف بناتا تھا کہ اس کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ ”شکر یہ۔“ مچھروہ حواسوں میں لوٹا۔ ”ہیں شراب نہیں پیتا۔“

”اوہ ہاں اس نے ہونٹ سکڑے، واقعی؟“ مچھروہ زور سے ہنس دی اور سنستی ہی چلی گئی۔ پھر ہنستے ہنستے وہاں سے ہٹ کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

سوہنی! "110" 110

مکتبہ محمدیان ڈابھٹ، ۲۰۲۰ء بازار راولپنڈی،

دعا کی تھی میں نے کہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے یہ علم نہ ہو کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ میں نے بہت دعا کی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر زود ہی۔

لیکن۔ ہم سیاہ نصیب کیا۔ اور ہماری دعا میں کیا تم زندہ ہو۔ اور میں تمہاری قریب کاروں کی عبرت ناک نشانی ہوں۔

سوہنی! مجھے معاف کر دو۔ دیکھو میں اب بھی اپنا نے کو تیار ہوں نہیں۔ میں شادی کر سکتا ہوں تم سے۔ دنیا سے جیسا کہ تم۔

”محض اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے نفرت سے تحقوک دیا۔“

”جھپ کر طوائف بننے سے کھلے عام طوائف کہلانا مجھے زیادہ منظور ہے۔ تم سے کہیں بہتر تو جھوٹے سائیں تھے۔ تمہاری دوسری بیوی بننے سے ان کی چوٹی بیوی بننا کہیں اچھا تھا۔“

”میں مجرم ہوں تمہارا۔ جو چاہو سزا سنا دو۔“

”ہا۔ سزا۔ وہ دوزخ سے نہیں۔“ ارے ایسی بی صاحب اتنے بڑے آدمی ہیں آپ ہم کچھ نہیں لوتھڑے لوگ کیا سزا سنائیں گے آپ کو۔ دنیا آپ کی کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، اوصاف آپ کی۔ ہمارا تو جس حدارہ جاتا ہے، اور درحقیقت وہی اصل سہارا ہے۔

اور۔ اور سزا نہیں اس دنیا میں ملے، نہیں نہیں، ایسی بی صاحب سرگرم ہیں۔ میں نے اگر زندگی میں کبھی کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اس کی خبر نہیں خدا سے صرف ایک ہی مانگوں گی، یومہ حشر کے دن تمہارا گریبان۔

ہاں اس دنیا میں، میں تم سے اپنی معصومیت اپنی سادگی، اپنی عزت کا خون بہا طلب نہیں کروں گی ایسی بی حسن جیلانی صاحبہ۔ اور نہ ہی آپ سے معاف کروں گی۔

میں اسے وصول کروں گی، لیکن یہاں نہیں بلکہ اس جگہ جہاں ایک دن ہر ظالم اپنے مظلوم کے روبرو حواریہ ہوگا۔

”سوہنی! اتنی بڑی بد دعا۔“ وہ گڑ گڑایا۔ ”میرے دل سے تو چھوٹا اس نے درد کی شدت سے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔“ کیسا درد اٹھا ہے اس میں۔ تمہیں دیکھ کر، تمہیں زندہ پا کر، تمہیں

بے غسرتی سے جیتا دیکھ کر۔ ایک حسین دنیا کا نور دکھا کر کس جہنم میں پہنچا یا ہے تم نے مجھے۔ کیا مجھ پر بقا میں سے تمہارا ایسی بی صاحب۔ میں سمجھتی تھی تم سچ مچ جا بجا تھو۔ میں سمجھتی رہی۔ تم زندہ ہوئے تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہوئے، اپنا وعدہ انکار کرنا ضرور نہیجئے۔ میں سمجھتی رہی۔ تم جان سے گزر گئے۔ میں نے آبرو ہوئی۔ لیکن تم نے تم کو زندہ ہو۔ تم زندہ ہو۔“

وہ تکرار کرتی آگے بڑھی، رینگ سے جھکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا وہ ایک جھٹکے سے پیچ جا گری۔

”سوہنی۔“ وہ بڑے زور سے چلا یا تھا۔

صبح کی سفیدی سارے۔ میں پھیل چکی تھی اور میری دھواں سا ان کے اندر بھی بھر رہا تھا۔ ”آج صبح کی سفیدی سارے۔ میں پھیل چکی تھی۔“

”آپ سوئے نہیں نا۔“ وہ آہستگی سے مڑے۔

”یہ دوں کی سیاہیوں کے عذاب اکثر ملکوں پر آ

چلیے۔ دراور سو جائیں۔ وہ نیند میں اس کی بات قطعاً نہ سمجھیں۔

”نہیں۔ میں جاگتک کرنے نکلوں گا۔“

وہ شانے پر رکھا دریا کا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر

صبح ہر طرف پھیل رہی تھی، اور احسن جیلانی

پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

One Urdu Photo.com

